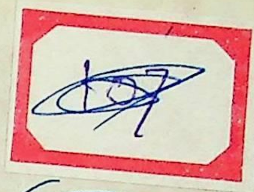

107

ٹرک جا رہی ہے

(افسانوں کا مجموعہ)

وحشی سعید ساحل

پوش پبلشنگ کمپنی کرن نگر، سرینگر کشمیر

★ میں ریاستی کلچرل اکادمی کے ارباب اختیار کا ممنون ہوں جنھوں نے مالی معاونت فرما کر اس کتاب کے اشاعتی کام میں میری مدد کی۔

★ اس مجموعے کے تمام کردار، واقعات اور مقامات فرضی ہیں، اور اصل واقعات، مقامات یا کرداروں سے ان کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔ جس کے لئے مصنف یا پبلشر پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہو سکتی۔

قیمت :- ۶۰.۰۰ روپے

بار اول :- ۱۰۰۰ مطبع :- شالیمار پریس سرینگر

ترتیب

اِنتساب

مرحوم پروفیسر عبدالقادر

سروری کے نام جس کی یاد ہمیشہ

میرے دل میں تازہ رہے گی۔

وحشی سعید ساحل

۵

سائے کی لاش

زندگی کے ارماں صلیب پر لٹکائے گئے۔ نازک دل کو شمشیر کی نوک پر اُچھالا گیا۔ میں رو پڑا۔

زندگی کے تلخ تجربے سے آدمی بے حس بن جاتا ہے۔ رقیہ بے حس نہیں تھی۔ وہ زندگی کی تیز اور گرم لہروں کی طرح پُرجوش اور باہمت لڑکی تھی۔ میں اُس کے کتابی چہرے کے عکسِ جمیل میں کھو کے رہ جاتا تھا۔ رقیہ کی آنکھوں میں شوخی پھوٹتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر دل فریب تبسم رہتا تھا اور وہ تبسم میری زندگی کا انمول سرمایہ بن گیا تھا۔

پھر — پھر رقیہ میرے تصاویر کی ماڈل بن گئی۔ میں کیا کرتا؟ میرا قصور نہیں تھا۔ وہ ہر وقت میرے کاغذ پر کارٹون بن کے رہ جاتی۔ میں حیران و پریشان ہو کے اس کارٹون کی ہر لائن درست کرنے لگ جاتا۔ مگر کوئی بھی لائن درست نہیں ہو پاتی تھی۔

وہ ہنستی
"کیوں ضائع کرتے ہو وقت۔"
میں کہتا۔
"میں وقت ضائع نہیں کرتا ہوں۔ ایک دن بہت ہی خوبصورت لڑکی کی تصویر بناؤنگا۔"
وہ چونک پڑتی۔
"کیا میں خوبصورت نہیں ہوں۔"
"تم خوبصورت ہو۔ بہت خوبصورت ہو۔" پھر میں کچھ سوچ کر کہتا "میں تمہیں بہت چاہتا ہوں"۔
وہ مجھے گلے لگاتے ہوئے کہتی۔
"میرے پیارے"۔
رقیہ اچھی تھی۔ بہت اچھی تھی۔ مگر جس دن اس کی منگنی ہوئی۔ وہ بے حس ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے وہ شوخ چمک غائب ہوگئی۔ اس کے ہونٹوں کا وہ دلفریب تبسم کسی اندھیرے غار میں دفن ہوگیا۔ رقیہ رو رہی تھی۔ میں نے رقیہ سے کہا۔
"تم رو رہی ہو۔"
وہ بول اٹھی۔
"تم دل کے درد کو نہیں جان پاؤگے۔"
شہنائی بجی۔ رقیہ مجھ سے دور ہوتی گئی۔ بہت دور ہوگئی۔ اور کسی

کے ارمان صلیب پر چڑھائے گئے۔

میں اس وقت سات سال کا تھا۔

میرے بوقلموں نے وقت کی رفتار پکڑ لی۔ رنگ برنگ خاکے سج گئے مگر کوئی حسین چہرہ نہ ابھرا۔ نہ جانے کیوں میری ٹیڑھی لکیر خوشنما پوائنٹ کو جنم نہ دے پائی۔

اُن دنوں مجھ پر وارفتگی نازل ہوئی۔ پھر جلدی میں آپ کو جمود کی سِل کے نیچے پستا ہوا محسوس کرنے لگا۔

وقت بھاگتا رہا اور اچانک اس بھاگتے ہوئے وقت نے میرے ہاتھوں میں ایک حسین تصویر سونپ دی۔ وہ تصویر کی طرح بے حس تھی۔

میرے سامنے والے مکان میں وہ لوگ ہنستے ہنستے آئے تھے۔ نئے کرایہ دار تھے۔ اپنی کھڑکی پر وہ ہر وقت کوئی موٹی سی ناول لے کے بیٹھ جاتی تھی۔ اور میرے بوقلموں نے ہمیشہ اس کی الٹی سیدھی تصویر بنا دی۔

وہ اپنا نام زرینہ رکھتی تھی۔ میں اس کو "زینو" کہتا تھا۔ گھریلو تعلقات نے "زینو" کو میرے قریب کر دیا۔ وہ میرے بے حس تصویروں کو سراہتی تھی۔ جیسے اُن تصویروں میں اس کی اپنی زندگی ملتی ہو۔ وہ مجھ سے کہتی۔

"میری ایک تصویر بناؤ۔"

میں ہنس کر کہتا۔
"مجھے اچھی تصویر بنانی نہیں آتی۔"
وہ سنجیدہ ہو کر کہتی۔
"تم بہت بڑی تصویر بناؤ۔ مگر ایک تصویر بناؤ۔ مجھے مریضوں کے درمیان ڈاکٹری لباس میں کھڑا کرنا۔"

پھر وقت دبے پاؤں بھاگتا رہا۔ زرینہ اپنے خیالوں کے جھولے میں سنہری خوابوں کو پالتی رہی۔ ایک دن ایک ڈاکٹر آگیا اس نے میری زرینہ کو اپنے ساتھ لیا۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ چلی گئی۔ مگر اس دن وہ ایک بے حس لڑکی نہیں تھی۔ اس میں ایک نئی زندگی آگئی تھی۔ جانے سے پہلے وہ میرے پاس آئی اس نے کہا۔

"میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں مجھے زندگی بھر اس کا افسوس رہتا کہ میں ڈاکٹر نہ بن سکی لیکن اب کوئی افسوس نہیں ہے۔ کیونکہ میں ایک ڈاکٹر کی بیوی بن گئی۔"

میرے رنگ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ لا سکے۔ میری ایک اور تصویر ضائع ہو گئی۔ نازک دل کو شمشیر کی نوک پر اچھالا گیا۔

ان دنوں میں بیس سال کا تھا۔

میں اب تصویروں کی دنیا میں کھو گیا۔ جہاں صرف خوابوں میں میں پریاں آتی ہیں۔ وہاں رانی کیتکی آنکھوں میں بھبھوت لگا کے میرے

پاس آتی ہے۔ یہ خواب کاغذ کے صفحوں پر پھیلتے گئے۔ لیکن یہ حسین خواب ایک چہرے کو جنم نہ دے سکے۔

میں شہرت کے گہوارے میں دل کے سکوں بھلا بیٹھا۔ لیکن جب دہلی میں تصویروں کی نمائش میں ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ میں دوڑا بہت دوڑا۔ وہ حسین تصویر تھی۔

نگار میرے تصویروں میں گم تھی۔ میں نے اس کے خیالات کو پکڑا۔

"پسند آئیں تصاویر۔"

وہ داد دینے لگی۔

"بہت خوب — بہت خوب۔ زندگی کو تصویروں میں بند کرکے دکھایا ہے۔"

"شکریہ۔"

"میں تو بہت عرصے سے آپ کے فن کی پرستار ہوں۔"

میں بے اختیار کہہ پڑا۔

"میں بھی تو بہت عرصے سے آپ کی تلاش میں تھا۔"

وہ مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں رقیبہ کے تبسم کی مٹھاس بھری ہوئی تھی وہ مجھ سے ملتی رہی۔ میرے تصاویر سے اپنے خیالات ظاہر کرتی رہی اور میری وضاحت طلب کرتی رہی۔ مگر وہ بھی کبھی کبھی زبیدہ کی طرح بے حس بن جاتی۔ میں نے ایک بار فیصلہ کیا کہ میں ایک حسین تصویر کو جنم دونگا

یہ پیاس نامکمل نہ رکھوں گا۔ ہر افرنز کی طرح ہر منزل کو پار کرتا رہوں گا لیکن مجھے تو ایک ہی منزل پار کرنی تھی وہ بھی کٹھن ۔۔۔!

پھر نہ جانے کیوں ساجنوں اور جوش ایک دن میرے دل میں اتر آیا۔ میں اس سے کہہ اٹھا۔

"نگار میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ فوراً بول پڑی۔

"آپ تو بوڑھے ہو گئے ہیں۔"

اس دن مجھے پہلی بار یاد آیا کہ میں پچاس سال کا ہوا تھا۔ نہ جانے میں کیوں رو پڑا۔

—۲

جمود کا جنازہ

جمود کا پیرہن چاک کرنے کی جدوجہد بڑی ہی دلفریب ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ ایک بے حس آدمی میں آپ حِس واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جمال کی زندگی پر بھی جمود چھا گیا ہے۔ اس کی زندگی بھی اب بے حِس ہو کے رہ گئی ہے۔ وقت کی تند اور تیز ہواؤں نے اس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ اگر اس کو آپ دیکھیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ایک مردہ ابھی ابھی قبر سے نکل کر آپ کے پاس چلا آیا ہے۔ لمبوترے چہرے میں اب صرف ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں۔ جو شاید اسلئے باقی ہیں کہ یہ جمال کی نشاندہی کریں۔ سوکھے ہونٹوں اور سوکھے بدن نے اسکو ایک اچھا خاصا کارٹون بنا دیا ہے۔ شاید اس لئے کہ اس کے بدن میں جمود نے زہر کا کام کیا تھا۔ جمود موت کی علامت ہے، ایک ایسی علامت جو انسان کی نس نس سے خون کھینچ لیتی ہے۔

پرانے تقاضے دم توڑ رہے ہیں اور نئی قدریں جگہ لے رہی ہیں وقت بدلتا جارہا ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ ایسے میں پچیس سال کے نوجوان کا جمود میں گرفتار ہونا ٹھیک نہیں ہے۔

جمال نے جذبے کو قتل کیا تھا اور قتل کر کے اُسے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کیا تھا۔ زندگی کے ساتھ یہ بے رُخی جان لیوا ہوتی ہے وہ میرا دوست تھا اور دوست کی زندگی کو میں اس طرح پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جمود کے ملبوسات اس سے الگ کر کے جذبے اور جد و جہد کا پیرہن پہن لینے کے لئے ہر وقت میں اس کو سمجھاتا رہا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ جیسے ایک گوشت و پوست کا آدمی پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو کے رہ گیا ہو۔ میں اُسے کہتا:

"تمہیں سب کچھ بھولنا ہوگا۔ نئے سرے سے نئی زندگی شروع کرنا ہوگی۔ ٹھنڈے جذبات کو گرمی کا احساس دلانا ہوگا۔ زندگی کو ایک مُشت غبار تصور نہیں کرنا ہوگا۔ تم جب تک اس دنیا میں ہو تب تک زندگی کا بوجھ زندگی کے اصولوں پر اُٹھانا ہوگا۔ اسی لئے اپنے آپ کو بے حسی کے جال سے نکال دو۔ نئی امنگوں کو اپنا رہبر بنا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کر دو"

وہ میری طرف ایسے دیکھتا کہ جیسے میں نے اُسے خود کشی کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ اس کی آنکھیں مجھ سے صاف یہ کہتی

ہولی نظر آئیں۔

"تم حالات سے بے بہرہ تو نہیں ہو۔ پھر بے بہرہ بننے کی کیوں کوشش کر رہے ہو۔"

ہاں! جمال کے ماضی کے حالات بھیانک تھے۔ جس کو یاد کرکے میرے بدن میں بھی خوف اور ڈر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ کتنا کرب اور درد اس کے دل میں چھپا ہوا ہے۔

رشتے کتنے کچے ہوتے ہیں، یہ اندازہ تب ہی ہوتا ہے جب انسان دھوکہ کھا لیتا ہے۔ ایک یتیم انسان جو دربدر کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور خود میں یہ احساس لئے پھرتا ہے کہ کوئی اس کا دامن تھامنے والا نہیں ہے۔ کس کو بھائی، بہن، دوست ماں کہہ کے پکارے۔ ایسے پیاسے آدمی کی پیاس بڑی دردناک ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں جمال اسی پیاس میں مبتلا رہا۔ جمال کی زندگی بچپن سے لے کر اٹھارہ انیس سال کی عمر تک رشتوں کے بندھن سے آزاد تھی۔ لیکن اچانک رشتوں کی پیاس نے اس کے دماغ کو آگھیرا۔ میں اس کا دوست تھا۔ جس نے ہر وقت اس کے چہرے پر بے فکری، اُبالی پن اور بے نیازی پائی، اچانک اس سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر اُس دن میں نے جمال سے کہا:

"تم آجکل پریشان نظر آتے ہو۔"

"ہاں ہوں" اس نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

" نہ جانے دماغ میں ہر بار یہ خیال رہ رہ کے کیوں آتا ہے کہ میری بھی کوئی بہن ہو لیکن کون بنے میری بہن !"

سوال تھا رشتہ قائم کرنے کا۔ لیکن آجکل کی اس دنیا میں رشتوں کی کیا کمی ہے۔ رشتے رشتوں پر قائم ہوتے ہیں۔ نفع اور نقصان پر تجارت کے صرف دکھوں پر۔ بکاؤ کی اس دنیا میں ہر چیز بک جاتی ہے۔ اس طرح ایک دن جمال کے گھر میں بھی ایک رشتے والی آگئی اس دن جمال نے مجھ سے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

" آج میں بہت خوش ہوں۔"

" کیوں ؟ پھر ایک بار تمہارے چہرے پر یہ رونق کیسے آگئی" میں نے معلوم کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے رازدارانہ لہجے میں جواب دیا

" میرے پیارے دوست مجھے بہن مل گئی "۔

" بہن مل گئی !" مجھے حیرانی ہوئی۔

ہاں فٹ پاتھ پر مل گئی وہ بھی میری طرح یتیم ہے، بے کس ہے، لاچار ہے۔ میں اُسے اپنے گھر لے آیا ہوں۔ گھر کا نظام اُس کے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے ایک بہن مل گئی "۔

میں واقعی خوش تھا کہ اس کی رونق واپس آگئی۔ ایک بار وہ پھر پہلا سا جمال نظر آنے لگا جس کے چہرے پر بے فکری، بے نیازی اور لا اُبالی پن تھا۔ دنیا نے نہ جانے کیا کیا الزام لیئے تھے اُس کے اور اُس کی بہن کے رشتے کے ساتھ وابستہ کیئے۔ لیکن جمال

نے دنیا کی پروا نہ کی اور دنیا کب تعلقات کو مدِّنظر رکھتی ہے۔ کوئی اگر کہتا۔

"بہن کے پاک نام پر ایک گناہ ہو رہا ہے۔"

کوئی قہقہہ لگاتا۔ "بہن"

کوئی کہتا

"جمال کے بھولے پن میں بھی ایک بہت بڑا شیطان چھپا ہوا ہے۔"

دنیا حقیقت جاننے کی تڑپ کب رکھتی ہے۔ باتیں بنانے والے خود ہی تبصرے کرتے ہیں اور خود ہی تجزیہ کر کے فیصلے دے دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمال نئی بہن کو پا کر ہر وقت مسرور نظر آتا تھا۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات پوری کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔

وقت بدلنے میں کب دیر لگتی ہے۔ رشتے کچے دھاگوں کی طرح کٹ جاتے ہیں۔ لیکن شبنم نے کب رشتے سے انکار کیا تھا۔ جمال کو وہ چاہتی تھی لیکن چاہت کا رنگ جُدا تھا۔ شبنم ایک ایسے رشتے کی قائل نہیں تھی جو وقتی ہو اور وقت کی تیز ہوا نے ایک خلیج اُن رشتوں کے درمیان پیدا کر دی۔ جب جمال نے۔ ایک دن اُس سے کہا:

"میری بہن اب بہت جلد ہم ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں۔ پھر میں ایک بار تنہا رہ جاؤں گا، لیکن لڑکیاں تو ہوتی ہیں پرائی

میں تمہاری شادی ایک اچھے گھرانے میں بہت جلد کرنے والا ہوں۔"
شبنم نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔
"اتنی بھی کیا جلدی ہے؟"
"تمہیں پہلے جلدی نہ ہوتی۔ لیکن اب تمہارا بھائی آگیا ہے۔ اُسے تو جلدی ہے۔ اُس کو اپنا فرض تو نبھانا ہے۔"
"جمال آج تک تم ایک بات نہیں جان پائے۔" شبنم نے آگے کہا
"میں تمہیں پیار کرتی ہوں، تم سے دور نہیں رہ سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ رشتے ہم خود ہی بناتے ہیں اور رشتوں کو ہم خود ہی ترتیب دیتے ہیں۔ میرے پاس ایک احساس ہے، ایک جذبہ ہے کہ تم ہی میرے جسم و روح کے مالک ہو۔ میرے خوابوں کے شہزادے ہو ـــــ پھر کیوں نہ ہم دونوں شادی کر لیں"۔
جمال یہ سن کر مجسمے کی طرح کھڑا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اُس کے جسم سے رُوح کھینچ لی ہو۔ یا کسی نے بُری طرح اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہو۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے نیک و بد خیالات میں ڈوبا رہا۔ دوسرے لمحے شبنم کا ہاتھ پکڑ کے اس نے شبنم کو اُسی وقت پاتھر پر چھوڑ دیا۔ جہاں کبھی اُس نے اس کا ہاتھ بھائی بن کر تھاما تھا۔

تب سے بار بار جمال کے دماغ میں یہ خیال آتا رہا۔
"رشتے کتنے کچے ہوتے ہیں۔ رشتوں کے دھاگوں میں نقص و

نقصان کی باتیں سوچی جاتی ہیں۔"

شبنم نے اُس کو بہت دکھ دیا تھا اور دکھوں نے اُس کو بے حس کر دیا تھا۔ کام سے اُس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ وہ دنیا کے کاروبار سے بے زار ہو گیا اور تمام دنیا اُس کو بے حسی کی تصویر نظر آئی۔ جہاں نہ رشتوں کی کوئی قیمت ہے نہ ہی انسانیت کا چراغ جلتا ہوا نظر آتا ہے۔

جمود نے دن بدن اس کی زندگی میں زہر کا کام کیا۔ میں اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ کر کلیجہ تھام کے رہ جاتا ہوں۔ میں اکثر اُس سے کہتا ہوں؛

"نکال دو اس جمود کا جنازہ تمہیں اپنا رنگ بدلنا ہوگا۔ زندگی سے یوں فرار ہو کر کب تک بھاگتے رہو گے۔"

وہ تھوڑی دیر کیلئے میرا منہ خاموشی سے تکتا رہتا۔ پھر دھیمی آواز میں جواب دیتا۔

"جمود میری زندگی کا روگ بن گیا ہے۔ اس جمود کا جنازہ اب تو میری زندگی کے جنازے کے ساتھ ہی اُٹھے گا۔"



تصویریں اُلجھی اُلجھی

اور یاد کی ہوا لاشعور میں سرسراتی چلی جاتی ہے۔ ایسے میں کچھ بے ترتیب قدموں کا شور ہوتا ہے۔ اُلجھے ہوئے برقعوں میں کچھ اُلجھے ہوئے چہرے بند تھے۔ اُن کی تیز اور کانپتی ہوئی آواز آئی۔

'پناہ چاہیئے۔'

میں چونک پڑتا ہوں

'ایں۔'

میں اپنے آپ کو کوستا ہوں۔ اس چھوٹے سے ڈرائینگ روم کو کوستا ہوں۔ ہر وقت کاغذوں کا انبار رہتا ہے۔ ہر وقت کاغذوں میں اُلجھا رہتا ہوں۔ باہر کیا ہوتا ہے؟ باہر کیا ہوا؟ باہر کیا ہوگا؟ سب کچھ سے بے خبر رہتا ہوں اسلئے میں اُن دو برقعہ پوش عورتوں سے پوچھ بیٹھا۔

"کیا لوگوں نے پھر کوئی ہنگامہ برپا کیا۔ کیا پولیس نے لاٹھی چارج کیا کیا لوگ بھاگ رہے ہیں۔ کیا شہر میں کرفیو ہوا؟

وہ دونوں ہنس پڑیں۔

میں اُن دونوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جیسے چڑیا گھر سے بھاگی ہوئی کوئی شے ہو۔ اُن کی ہنسی میرے لئے زہریلا طنز بن گیا تھا۔ میں اُن کی ہنسی کو اپنے قہقہے میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔

لیکن میں قہقہہ نہیں لگا سکا۔

کیونکہ وہ عورتیں تھیں ...... اور میں مرد تھا ــــ

"ایک سوال کا جواب دیجئے ــــ کیا ــــ واقعی کوئی ہنگامہ ہوا۔"

"ہنگامہ ضرور ہوا جناب، اُن دونوں عورتوں میں ایک نے کہا" لیکن لوگوں کے ساتھ نہیں ہوا۔ پولیس کے ساتھ بھی نہیں ہوا۔ بلکہ ہمارے ساتھ ہنگامہ ہوا ہے۔"

عورت بذاتِ خود ایک ہنگامہ ہے۔ صدیوں سے عورت ہنگامہ برپا کرتی رہی۔ لیکن یہ کیسے ہوگا کہ کوئی عورت کے ساتھ ہنگامہ کرے۔

میں نے حیراں ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہوگا؟"

"ارے جناب" اُن میں سے ایک نے کہا۔" آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب عورت دبی ہوئی تھی۔ وہ وقت چلا گیا جب کہ شریف آدمی عورت سے کہتا تھا۔ "Ladies first" "لیکن اب

بس ہو یا سینما ہال، ہسپتال ہو یا نمائش گاہ ہو۔ ہر جگہ عورت کو قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے اور اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

میں سنجیدہ ہو گیا، نہ جانے میں کیوں ایسے موقعوں پر سنجیدہ ہوتا ہوں۔ پھر سنجیدگی ایسے موقعوں پر پُراسرار بن جاتی ہے۔ لیکن میں پُراسرار سنجیدگی میں رہنا پسند نہیں کرتا ہوں۔ اس لئے میں نے کہا۔

"ہاں زمانہ واقعی بدل گیا ہے۔ تب عورت چار دیواری میں رہتی تھی۔ دفتر ہوٹل سینما کی زینت نہ تھی۔ لیکن اب زمانہ بدلا ہے عورت بدلی، مرد بدلا، اصول بدلے زمانہ بدلا۔" وہ دونوں عورتیں میرے میز کے سامنے دو کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ مگر چہرے پردوں میں بند تھے۔

بند چہرے اُلجھنیں پیدا کرتی ہیں۔
اور تصویر نامکمل رہ جاتی ہے۔

"جی ہاں واقعی سب کچھ بدل گیا" اُن میں سے ایک نے کہا۔" وہاں کیا کوئی ہمیں تعاقب کرتا اور اس کا تعاقب ہمیں پناہ لینے کے لئے مجبور کرتا۔ بھلا ہو آپ کا آپ کی شرافت کا، آپ جیسے ہی لوگوں سے دنیا میں مروت شرافت اور انسانیت کی کوئی چیز بچ گئی ہے۔"

یہ سب سنکے میں تھوڑی دیر کے لئے پھسل جاتا ہوں اور میرا احساس برتری میں مبتلا ہوتا ہوں میں ایک عام انسان سے بالاتر ہو جاتا ہوں۔ ایک دیوتا!

لیکن میں دیوتا نہیں بننا چاہتا ہوں!!
میں صرف آدمی رہنا چاہتا ہوں!!!
وہ عورتیں مجھے میرے دھونڈکوں سے نکال دیتے ہیں۔
"اب تو ڈاکخانہ ہمارے لئے پناہ گاہ بن ہی گیا۔ اس پناہ گاہ میں کچھ کام بھی ہو جائے۔ میں کچھ روپے اپنے saving account میں جمع کرنا چاہتی ہوں۔ یہ لیجیے پاس بک......"
دوسری نے کہا
"میرا پاس بک بھی لیجئے۔ میں کچھ پیسے بھرنا چاہتی ہوں۔"
دو پاس بک میرے سامنے تھے۔
راشدہ!
فاطمہ!!
میں نے ہنستے ہوئے کہا؛
"یوں کہئے آپ پیسے جمع کرانے آئے تھے۔"
"نہیں پوسٹ ماسٹر صاحب" راشدہ نے کہا۔ "یقین کیجئے ہمارا تعاقب ہو رہا ہے شاید وہ ذات یہاں بھی آئے۔ زبردست خطرناک اور خوفناک
فاطمہ کے ہاتھ میں کچھ کتابیں تھیں
سیاہ برقعے سے کچھ زلفیں باہر آگئی تھیں۔
میں نامکمل تصویروں کو پسند نہیں کرتا ہوں۔
جب میں بہت زیادہ کسی مسئلے پر سوچتا ہوں تو مجھے اپنا خاندانی سنگھ

کی نصیحت یاد آتی ہے۔

"دماغ پر زیادہ زور نہیں ڈالنا چاہیئے ورنہ دماغ پھوٹ جائے گا۔"

میں نے دماغ کے انتشار سے چھٹکارا پانے کے لئے فاطمہ سے کہا:

"کیا میں ان کتابوں کو دیکھ سکتا ہوں۔"

اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا:

"لیجیئے۔"

تین کتابیں تھیں۔ پہلی کتاب دیوانِ غالب تھی۔ میں نے اس کتاب کی ورق گردانی کی۔ میں نے معلوم کرتے ہوئے کہا:

"غالب آپ کا پسندیدہ شاعر ہے۔"

"میرے پاس پسند کو دخل نہیں ہے۔" فاطمہ نے کہا۔ "میرے پاس شعور کی اہمیت ہے۔ چند دنوں سے اخبار، ریڈیو، رسالوں میں غالب کا ذکر پایا سوچا ذرا اس قیامت برپا کرنے والے کی کتاب کو بھی دیکھ لیں۔"

عجیب دلیل ہے، عجیب انداز ہے۔

کچھ بھی ہو اس کو اپنی انفرادیت کا شدید احساس تھا۔ لیکن ایسی انفرادیت کبھی کبھی بوجھ بن جاتی ہے۔

تکلیف دہ بوجھ ———

میں نے پھر سوال کیا

"لیکن تمہارا پسندیدہ شاعر تو کوئی ہوگا؟"

"ہاں ہے۔"

"کون ہے"
"عورت"
"کیا مطلب"
"جی ہاں عورت وہ عورت جس نے دنیا کی شاعری کو جنم دیا۔ دنیا کو جنم دیا۔ میں اس کو بڑی شاعرہ سمجھتی ہوں۔"
"او"
اس لئے میں خود کو بہت بڑی شاعرہ سمجھتی ہوں۔"
شاید وہ احساس کا توازن کھو بیٹھی تھی، بُرے اور بھلے میں تمیز نہیں کر پاتی وقت کی تند ہوا میں ڈگمگا گئی ہے۔
میں نے راشدہ سے پوچھا
"یہ تمہاری کون لگتی ہے؟"
"میری سہیلی ہے۔"
اچانک مجھے کچھ یاد آگیا
"وہ تعاقب کرنے والا کہاں گیا ہوگا؟"
راشدہ نے کہا
"یہاں تو نہیں آیا۔"
میں نے کہا
"لیکن کون تھا وہ"
راشدہ نے کہا
"وہ میرا ہونے والا خاوند تھا۔"

میں تھوڑی دیر کیلئے پردے میں چھپے ہوئے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے تاثرات پڑھنے کے لئے وہاں پر سیاہ موٹا برقعہ حائل ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا

'یہ جان کر بھی تعاقب کرتا رہا کہ تم اس کی ہونے والی بیوی ہو اور کبھی اس کے پاس تم چاروں پہر ہوگی'

راشدہ نے کہا

'لیکن پوسٹ ماسٹر صاحب وہ ہونے والی بیوی کا تعاقب نہیں کرتے تھے وہ میری سہیلی فاطمہ کا تعاقب نہیں کرتے تھے وہ جو اس کی محبوبہ ہے۔

"تو ــــ"

میری زبان کام کرنا جواب دے گئی تھی میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن پوچھ نہیں پاتا تھا۔ آخر کہہ ہی ڈالا۔

"لیکن یہ سب ــــ"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" راشدہ نے کہا۔" یہ ضروری نہیں کہ جو بیوی ہو وہ محبوبہ ہو اور جو محبوبہ ہو وہ بیوی ہو اور میں فاطمہ کے ہونے والے خاوند کی محبوبہ ہوں۔"

"اخلاق" میں چونک پڑا

فاطمہ کہہ اٹھی ۔

آپ لوگ دقیانوسی خیالات سے اخلاق کا دائرہ تنگ کرتے ہیں
اخلاق کا دائرہ تنگ مت کیجیے۔"

میں تقریباً اب چیخ پڑا۔

"پھر اس تعاقب پر گھبرا کیوں گئے؟"

راشدہ نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا

"کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ایک مرد ایک ساتھ بیوی اور محبوبہ کو دیکھ لے وہ قابو میں نہیں رہتا۔

پاس رکے تیار ہو گئے تھے۔

فاطمہ اور راشدہ چلی گئی۔

کیا کبھی پھر ان سے ملاقات ہوگی!!

لیکن میں ان کو کیسے پہچان لوں گا۔ ان کے چہرے تو برقعوں میں بند پڑے تھے۔

لیکن میں ایسی عورتوں کو جانتا ہوں
ایسی نامکمل تصویروں کو جانتا ہوں۔ ※ ※

ہنسی کا قتل

ماتھر زندگی کی بھول بھلیوں میں کھونے والا آدمی نہیں تھا سنجیدگی کبھی اس کی زندگی میں داخل نہ ہوئی تھی۔ مذاق کو زندگی اور زندگی کو مذاق سمجھتا تھا۔ وہ سنجیدگی کو موت تصور کرتا تھا۔ اور موت کو وہ دعوت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ زندگی اس کو پیاری تھی۔ زندگی سے وہ پیار کرتا تھا اور زندگی وہ کسی بھی قیمت پر کھو دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

اکثر لوگ ایسے لوگوں کی ذہنیت پر شک کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صرف سنجیدہ قسم کے لوگ اپنے سامنے زندگی کا نصب العین رکھتے ہیں۔ زندگی کے اصول پر جیتے ہیں اور پھر ایک کامیاب زندگی کو پاتے ہیں۔ لیکن ماتھر غیر سنجیدہ ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی کے سامنے ایک نصب العین

رکھتا تھا۔ احساس بھی رکھتا تھا اور فرض شناسی کا گہرا مادہ بھی لیکن وہ اس قول پر ایمان رکھتا تھا کہ زندگی کے دن زندہ دلی سے پورے کرنے چاہئیں۔ الجھنوں میں آدمی گم ہو کے صرف الجھنیں ہی الجھنیں پیدا کرتا ہے۔ آخر میں آدمی مشین بن جاتا ہے۔ مشین بن کے بے حس ہوتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں تھی ایک سوز و گداز بھرا ہوا ہوتا ہے۔ زندگی کے پتھر اور لوہے جیسے راستے کو طے کرنے کیلئے آدمی کو ایک مضبوط کلیجہ چاہئے۔ نہ کہ نڈھال جیسا چہرہ بوجھ ہر ایک کے پاس رہتا ہے۔ ماتھر کے پاس بھی بوجھ تھا۔ اس کی بہن —— جواں اور کنواری بہن جس نے زندگی کے سولہ سال طے کئے تھے وقت سے پہلے حد سے زیادہ جواں ہوئی تھی۔ بڑے بڑے اعضا، لمبا قد دلکش چہرے کی وہ مجسمہ تھی لیکن وہ اس بوجھ سے غافل نہیں تھا پریشان بھی نہیں تھا۔ سمجھتا تھا کہ ہر کام وقت پر ہوگا اور ہر کام کے لئے اپنا وقت ہوتا ہے۔ وقت سے پہلے کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔

جب وہ بی اے میں تھا اور اس کا والد زندہ تھا۔ اس کی ماں نے پہلے ہی عالم ارواح میں قدم رکھا تھا۔ والد ان دنوں بیمار ہوا۔ بیمار والد نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اپنی بہن کی زندگی کو آرام و آسائش سے بھر دے گا۔ اس کی شادی کرے گا۔ اس کی زندگی کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ یہ بوجھ تھا۔ ایک بھاری بوجھ۔ جو اس کو ہر وقت یاد دلاتا رہتا تھا کہ اس

کو کیا کرنا چاہیے۔

ایک اوسط درجہ کی زندگی۔ دو یا ڈھائی سو کی آمدنی۔ ایک اچھی زندگی کے لئے ڈھائی سو روپیہ کی آمدنی بہت کم ہوتی ہے۔

زندگی بذات خود ایک بوجھ ہے۔ بوجھ پر بوجھ زندگی کو مشکل اور کٹھن بناتا ہے۔ آسان راہوں میں کانٹے بکھیل جاتے ہیں۔ لیکن زندگی کے اس روگ کو ہنستے ہوئے مقابلہ کرنا دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ شان بے نیازی وقت کے ساتھ ساتھ اُس آدمی میں پیدا ہو جاتی ہے یا وقت اس کو مسخرہ بنا لیتا ہے۔ لیکن لیکن وہ نہ وقت کے ساتھ مسخرہ بنا۔ نہ ہی اُس میں شان بے نیازی پیدا ہوئی لیکن احساس کا بوجھ اور فرض کا بوجھ اس میں ہر وقت موجود رہا لیکن ان سب سوالوں کا اس کے پاس صرف ایک ہی جواب تھا۔

"وقت پر سب کچھ ہوگا۔"

وقت تیزی کے ساتھ بھاگ رہا تھا اور وقت کی تیز ہواؤں نے اس سے اس کی ہنسی ہنہیں چھین لی۔ دفتر کی کلرکی تک ماتھر کی زندگی محدود ہو گئی۔ یہاں پر آشا رتیا اور شانتی تھیں۔ یہ لڑکیاں دفتر کی جان تھیں۔ لیکن آشا کی ناک لمبی تھی۔ تیلی تھی۔ ماتھر اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ اس سے کہتا

"آشا تیری یہ ناک ریل کی طرح ہر دن کیوں آگے کی طرف بھاگ رہی ہے۔"

وہ ماتھر سے کہتی

"مسٹر ماتھر اپنے کام سے کام رکھو۔"

وہ واپس ہنستے ہوئے کہتا۔

"کام سے کام تو رکھوں لیکن تیری ناک کو کیا کروں؟"

وہ غصہ ہوتی

"او شٹ اپ۔"

کبھی کبھی وہ گالیاں بھی بک دیتی لیکن مجال تھا کہ ماتھر کبھی ہنسی کو ہاتھ سے جانے دیتا۔

ریٹا ایک اینگلوانڈین لڑکی تھی جو مذاق کا جواب مذاق سے دیتی تھی۔ وہ خوبصورت لڑکی نہیں تھی۔ لیکن اس احساس کی تلخی کو کم کرنے کے لئے وہ ہر وقت ہر ایک پر مسکراہٹ پھینک دیتی۔ ماتھر اس سے کہتا۔

"او۔ کالی لڑکی تم دلچسپی کا موضوع بنتی۔ لیکن کالی نہ ہوتی۔"

وہ جواب دیتی

"او۔ مسٹر تمہارے دانت شیر کے جیسے ہیں۔ مجھے ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں مجھے تم کھا نہ جاؤ گے۔"

وہ اپنا منہ لمبا کرتا اور کہتا

"آ ——— کھا جاؤں۔"

سب ہنس پڑتے۔ ماتھر کی یہی ادائیں دفتر کی زندگی تھی سنجیدگی کو ریش، موہن، رحمان، سلطان کو جواب دینا پڑتا تھا۔ وہ گھر

میں گھر کے بوجھ کو بھول جاتے تھے۔ اُلجھنوں کو خیر باد کرتے تھے۔ زندگی کے گمبھیر لمحوں سے فرصت پاتے تھے۔ لیکن یہ سب ماتھر کی کرامت تھی۔

اوشا بھی حسین لڑکی نہیں تھی۔ اس لئے وہ بھی ماتھر کے مضمون محبت نہ بن سکی۔ حالانکہ بائیس سال کی عمر میں قدم رکھتے ہوئے ماتھر نے شدت سے محسوس کیا کہ کوئی اس کا مضمون محبت ہے۔ لیکن اب تک کوئی لڑکی نہ اس کو دفتر میں ملی اور نہ دفتر سے باہر۔ اس کی بہن کامنی جواں ہو رہی تھی۔ وہ حسین تھی۔ زندگی کا حسین نغمہ تھی۔ وہ کبھی کبھی سوچتا تھا۔

"کاش مجھے بھی کامنی جیسی لڑکی ملتی۔"

پھر وہ خود ہی اپنے خیال کی تردید کرتا تھا۔

"نہیں کامنی جیسی نہیں ——!"

خیالات بھی عجیب ہوتے ہیں نہ قابو میں آنے والے خیالات۔ خیالات آتے ہیں جاتے ہیں تیز رفتاری کے ساتھ آدمی کو گرفت میں لیتے ہیں۔ خیالات سے آزاد ہونا ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن خیالات کب آدمی کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں۔ خیال ہی زندگی ہوتی ہے خیال ہی کے ارد گرد زندگی کٹ جاتی ہے۔

مگر سریتا خیال نہیں تھی۔ وہ ایک حقیقت تھی حقیقت کا

ایک شاہکار تھی حسن کی ایک بھرپور نمائندہ۔

وہ کامنی تھی یا کامنی کی طرح حسین تھی۔ دفتر میں اس نئی لڑکی سے ہلچل پچ گئی۔ سریتا کو عورتوں میں حسن کی وجہ سے برتری حاصل ہو گئی تھی اسلئے ریتا، آشا اور اوشا اکثر کھسر پھسر کرتی رہتی تھی۔ شاید وہ کسی ایسے منصوبے کو ترتیب دینے کی کوشش میں تھیں جس سے وہ سریتا کو چلتا پھرتا کریں اس طرح ان کا مارکیٹ سرد نہ ہو جائے، مردوں میں وہ موضوع حسن بن گئی تھی۔ اس کی ہر ادا میں شاعرانہ تجزیوں کو ناپ تول کے ہر ایک پیش کرتا تھا۔ ماتھر ان کی تعریفوں کو سنکے قہقہہ لگا دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔

"مسٹر سلطان تم چار بچوں کے باپ ہو، تمہیں اُن کے جوتوں، کپڑوں سکول کی فیس کی فکر کرنی چاہیئے۔ رحمان تمہیں تمہاری بیوی نے چھوڑ دیا ہے تم اس لائق اپنے آپ کو بناؤ کہ تمہیں تمہاری بیوی منظور کر لے۔ رمیش اور موہن کو اپنی اُستانی بیویوں کے میک اپ کے سامان کی فکر کرنی چاہیئے ——— اور ——— میں ——— میں ٹھہرا کنوارا ——— مجھے سریتا کی فکر کرنی چاہیئے۔

لیکن ماتھر سریتا کی فکر نہیں کرتا تھا بلکہ اُس سے عشق کرنا چاہتا تھا اور اس عشق کے لیئے ایک آسان راہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے سریتا سے کہا

"مس سریتا ذرا ان زلفوں کو پردے میں رکھ لیجیئے۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ ناگن ڈس نہ لیں۔

سریتا نے تیز آواز میں کہا:

"مسٹر مجھے آپ کی یہ بے ہودہ حرکت بالکل پسند نہیں ہے۔"

ماتھر نے برابر ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم بھی تمہاری ان لٹوں کو وارننگ دیتے ہیں کہ یہ ہمیں ڈسنے کی کوشش نہ کریں۔"

سریتا نے تیز آواز میں پھر جواب دیا۔

"مسٹر آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے میں ایک ایسے خاندان سے آئی ہوں جہاں ایسی بے ہودہ حرکتوں کی اجازت نہیں ہے۔"

اوشا نے سریتا سے کہا:

"سریتا تم شاید ماتھر کی نیچر سے واقف نہیں ہو۔ یہ Happy go lucky fellow ہے۔ سریتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کام کے ساتھ مصروف رہتی۔ ماتھر اس لڑکی کا مضمون نہ سمجھ سکا حالانکہ وہ اپنی دل کی دنیا سریتا سے وابستہ کر چکا تھا لیکن وہاں سنجیدگی تھی جو ماتھر کے لئے موت تھی، ماتھر نے دل دیا۔ دل کا سودا سریتا کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تین ماہ تک اس کو کامیابی نہ ہو سکی۔ دل ہی دل میں ماتھر سوچنے لگا۔

"شاید کامیابی کے امکان بھی کم ہے۔"

لیکن ایک دن سریتا کے چہرے پر وحشت برستی تھی۔ زندگی کے آثار بجھ گئے تھے۔ وہ موت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس کی سنجیدگی دیکھ کر ماتھر نے کہا:

"کیا بات ہے کہ تم موت کی طرف دوڑی جا رہی ہو۔"
اس نے واپس جواب دیا
"زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔"
ماتھر نے ہنستے ہوئے کہا
"آ ـــــ زندگی سے تنگ آ گئی۔ تمہارا باپ بیمار ہوگا۔"
سریتا نے کہا
"باپ نہیں بھائی وہ بھی چھوٹا ہے۔"
ہمت نہیں ہارتے" ماتھر نے ہنستے ہوئے کہا "یاد رکھو جس نے ہمت ہاری ہنسی کو ہاتھ سے چھوڑ دیا وہ مرتا ہے۔ مر کے مسلے حل نہیں ہوتے کیا تم اپنے بھائی کو مجھے دکھا سکتی ہو۔"
"دیکھنا چاہتے ہو دیکھ لو آج میرے ساتھ گھر آنا وہاں میری بوڑھی ماں ہے۔ بیمار بھائی اور میں۔ باپ نے سب کچھ میرے کندھے پر چھوڑ دیا۔"
اس دن آفس سے نکل کر ماتھر سریتا کے پاس اس کے گھر گیا۔ گھر وہی بوسیدہ تھا۔ افلاس کی زندگی، غربت کی زندگی، سخت اور مشکل زندگی سریتا کا بوجھ بہت سخت بوجھ تھا۔ وہاں غربت ضرور تھی مگر شرافت تھی۔ ایمانداری تھی اور سچائی تھی۔
مگر اس ایمانداری اور سچائی کے پیچھے مشکلات تھے، مصیبتیں تھیں اس کے چھوٹے بھائی کی ایک ٹانگ اچانک بیکار ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر یہ تسلی دے رہا تھا۔ شاید اس کی ٹانگ ٹھیک ہو گی۔ مگر کل کی اُمید

پر بہت بڑا خواب دیکھ رہی تھی۔

"ایک زمانہ تھا میرا ایک دوست میرے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ میں اس کو ہر بار کرکٹ میں زیادہ سے زیادہ چار رن پر آؤٹ کرتا تھا۔ لیکن حقیقی زندگی میں وہ ڈاکٹر بن گیا اور میں کلرک ـــــ قابل ڈاکٹر ہے۔ اس کے پاس تمہارے بھائی کو لینگے۔"

"لیکن!" سرِیتا نے کہا

"لیکن اس معاملے میں نہیں چلے گا۔ کچھ نہیں بھی کرنے دو" اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کو بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔

پھر کل سرِیتا کے بھائی کو ماتھر نے اپنے دوست ڈاکٹر کے پاس لیا۔ اس کے دوست ڈاکٹر نے ماتھر سے کہا۔

"ایک سال تک اس کی ٹانگ میں طاقت آئے گی۔ لیکن ہر دن اس مالش کو ایک ایک گھنٹہ تک کرنا ہوگا۔"

ڈاکٹر سے یہ اطلاع پاکے مسرور رہا۔ ماتھر نے ہنستے ہوئے ڈاکٹر سے کہا:

"میرے دوست تم نے حق دوستی ادا کیا۔ میرے عشق کی دنیا کو آباد کرنے میں تمہاری دوستی کام آگئی۔"

ڈاکٹر نے زور زور سے قہقہہ لگا لیا۔ ماتھر نے ساری حقیقت سرِیتا کے سامنے بیان کی۔ سرِیتا نے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کم از کم ایک سال تک تو یہ اُمید رہے گی کہ بھائی کی ٹانگ ٹھیک

ہو گی۔" مائیکر نے ہنستے ہوئے کہا:

"امید نہیں ہے بلکہ صحیح ہے وہ میرا دوست ہے وہ مجھ سے غلط نہیں کہے گا۔ جھوٹی تسلی نہیں دے گا اسلئے یہ اُمید نہیں ہے۔ اس پر یقین رکھو کہ ایک سال کے بعد تمہارے بھائی کی ٹانگ ٹھیک ہو گی۔"

سریتا غور سے مائیکر کی باتیں سنتی رہی اُن دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی پھر اچانک سریتا نے کہا۔

"لیکن آپ یہ سب تکلیف میرے لئے کیوں اٹھاتے ہیں میرے دکھوں کے ساتھی کیوں بن گئے۔؟"

مائیکر نے ہنستے ہوئے کہا:

"سریتا تم سچی بات سننا چاہتی ہو۔"

"ہاں"

"سنو ــــ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔"

پھر اچانک خاموشی چھا گئی وہی خاموشی جو دلوں کی چاہت کی ضمانت ہوتی ہے۔ اس میں محبت پلتی ہے اور جواں ہوتی ہے۔ محبت زندگی ہے اور زندگی کی خوشی اور آہنگ کو برقرار رکھنے کے لئے محبت کرتے رہنا ضروری ہے۔

محبت کرتے رہنا ضروری ہے۔

مائیکر نے پھر سلسلہ خاموشی توڑا۔

"میں بھی کیسا آدمی ہوں۔ اظہارِ محبت کر بیٹھا یہ جان لینے سے پہلے کہ

یہ آگ دونوں طرف سے ہے یا میں ہی اکیلا اس آگ کا شکار ہوں؟

"محبت کو آگ کہتے ہو ——— نہیں ——— نہیں ——— اس کو نور کہو ——— نور ——— سچی محبت انسان کی سچی عبادت ہوتی ہے زندگی کا سب سے عظیم کارنامہ ہوتا ہے۔ مگر وہ محبت جس میں کھوٹ نہ ہو، لالچ نہ ہو۔ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ میرے دل کے آئین خانے میں ہمیشہ کے لئے تمہاری محبت نے اپنا مسکن قائم کیا۔ جس کو وقت کی تند و تیز ہوائیں مٹا نہیں سکیں گی۔ زندہ رہے نہ رہے ہم ایک دوسرے کے قریب آئیں یا نہ آئیں لیکن ہماری محبت میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیئے۔ اس کے درمیان نہ تو وقت کی دیوار نہ ہی ہمارے لیے خیالات کھڑے ہوں گے۔"

ماتھر نے ہنستے ہوئے کہا

"لگتا ہے بہت دنوں سے ایک سر تھا مجھ سے پوشیدہ رہی جس کی سنجیدگی میں بھی ایک فلسفہ چھپا ہوا ہے جس کی محبت میں محبت کی عظیم معنی و مفہوم پوشیدہ ہے۔ لیکن میں زندگی کے ہر راگ کو ہنستے ہوئے گاتا ہوں۔ دکھ کی چھاؤں کو بھی خوشی کے پھوار میں بدل دیتا ہوں۔ محبت کو محبت سمجھتا ہوں اور اس کو پھولتے پھلتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

پھر وہ ایک دوسرے کے قریب ہوگئے۔ ایک دوسرے کے دل میں سما گئے۔ فرصت کے لمحات اکٹھے گذارتے تھے۔ کبھی سمندر کے ساحل پر بیٹھ کر بڑی موجوں کو دیکھتے تھے جو موجیں شاید اس کوشش میں لگی

ہوئی ہوتیں۔ کہ وہ بھی ایک بار صرف ایک بار آسماں کی وسعت کو چوم لیں اور شاید ماتھر بھی چاہتا تھا کہ ایک بار صرف ایک بار وہ سرِتیا کے لال ہونٹوں کو چوم لے۔ لیکن وہاں صرف ہر بار ایک ہی جواب ملتا۔

"نا.... نا.... نا"

یہ نا ہمیشہ حائل رہے۔ قدامت کے رنگ میں رنگی سرِتیا کے خیالات نہ بدل سکے۔ وہ 'نا' پر اٹل رہی لیکن ماتھر کی محبت تشنہ رہی۔ آخر کب تک وہ جذبات کو برداشت کرتا رہتا۔ لیکن سرِتیا تھی جو ہر بار اس کو ٹالتی رہتی تھی ہر بار کسی نہ کسی بہانے اس کے محبت کو تشنہ رکھتی

ایک دن جب وہ ساحل پر گھروندے بنا رہے تھے۔ ریت کے محل ریت کے جو گر جاتے ہیں۔ مخالف ہوا کبھی ریت کے گھروندے کو صحیح سالم نہیں رکھتی۔

"کب تک ریت کے گھروندے بناتے رہیں گے۔ کیا کبھی ہم حقیقی دنیا میں آکے بھی کچھ سوچ لیں۔ کیا ہم یہ نہیں سوچ سکتے کہ ہم مضبوط بنیادوں پر ایک گھر تعمیر کرلیں۔"

سرِتیا نے کچھ سوچ کے جواب دیا:

"ماتھر صاحب گھر دل میں بنتے ہیں اور گرتے ہیں۔ جب تک دل میں گھر آباد ہو تب تک کسی اور گھر کو بنانے کی ضرورت نہیں۔ ہے دل کے گھر کو آباد رکھنا ہوگا۔"

"وہ تو رہے گا۔" ماتھر نے کہا۔ لیکن میرا مطلب ہے کہ کیوں نہ ہم

شادی کرلیں جو دوری اب تک ہمارے درمیان کھڑی ہے۔ اسکو بھی ختم کرلیں۔"

سریتانے ہنستے ہوئے کہا۔" سوچنے کی بات ہے۔"

'یعنی مسئلہ غور کے لائق ہے۔' ماتھر نے ہنستے ہوئے جواب دیا 'اب اس چیز کو مسئلہ کیوں بنانا ہے۔ کوئی دن مقرر کرو ہم دونوں سادے طریقے سے شادی کرلیں۔ اب ہم اس مسئلے کو سوچ کے دائرہ میں داخل کریں تو پھر کبھی —'

"حل نہ ہوگا" سریتانے بات کاٹتے ہوئے کہا۔" یہ بھی تم نے سچ کہا۔ لیکن اس بات کو کیا کیا جائے کہ میرے ذمے میرے والد نے میرے اپاہج بھائی اور ماں کو چھوڑا۔'

'دیکھو — میں نے تمہیں پہلے ہی دن کہا ہے کہ تیرے میرے مسئلے ہیں۔ تیرے دکھ میرے دکھ ہیں۔ پھر تم کیوں بھول جاتی ہو کہ دو گھر ایک ہی گھر میں تبدیل ہوں گے۔'

"ہوں گے ضرور ہوں گے' سریتانے ہنستے ہوئے کہا۔"لیکن پہلے اس سلسلے میں تمہیں ماں سے بات کرنی پڑے گی۔"

'اچھا۔ جی — اب تمہارے بعد تمہاری ماں کو بھی جتانا ہوگا۔' ماتھر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن محترمہ یہ کام بہت مشکل ہے۔"

'کیوں؟'

'کیونکہ مجھ میں ہمت نہیں ہے۔"

"ہمت پیدا کرو۔"

"ہمت پیدا ہو سکتی ہے۔" یہ کہہ کر ماتھر سریتا کے قریب ہو گیا اپنی باہیں پھیلا دیں اور کہا اگر میں ایک بار تمہارے نازک ہونٹوں کو چوم لوں۔"

"نا" سریتا نے انکار کیا۔ "یہ سب شادی کے بعد۔"

"لیکن" ماتھر اس کے ہونٹوں کو چوم لینے کے لئے کوشش کرنے لگا سریتا اس کی باہوں سے نکل گئی پھر کہنے لگی۔

"اب میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ میں جا رہی ہوں۔"

وہ چلی گئی ماتھر دیکھتا رہ گیا۔ ماتھر کو اپنی بے بسی پر سخت غصہ آیا لیکن پھر خود ہی ہنس پڑا اور خود سے کہنے لگا۔

"چلی آئے گی سرکار بندھی کچے دھاگوں سے۔"

وہ جانتا تھا وہ جائے گی لیکن وہ اپنے ان تشنہ جذبات کو کیا کرے۔

ماتھر نے اپنے آپ سے کہا۔

"عجیب لڑکی ہے یہ سریتا بھی اب تک قدیم خیالوں کو سینے سے لگائی ہوئی بیٹھی ہے۔"

ماتھر کو وہ زمانہ یاد آیا جب والدین کی موت کے بعد اس نے شراب سے دل بہلایا تھا۔ نشے میں رہتا تھا نشہ کب تک رہتا، نشہ اتر گیا آج ماتھر کو پھر وہی شراب یاد آئی وہی نشہ یاد آیا۔

یہ جذبات بھی کبھی کبھی بے ہودہ ہوتے ہیں، ستاتے رہتے ہیں۔ ان سے نجات ہی نہیں ملتی، دماغ ان میں الجھ جاتا ہے اور دماغ الجھتا ہو کبھی بھی ماتھر

کو پسند نہیں ہے پھر اس کی سینس مکھ طبیعت میں فرق آتا تھا۔ یہ بات ہرگز ماتھر کو پسند نہیں تھی کہ وہ سنجیدہ ہو جائے اور موت کا نشکار ہو جائے پھر خود بخود اس کے قدم اُس شراب خانے کی طرف بڑھے۔ جہاں چند سال پہلے اس نے دل کھول کے شراب پی۔ آج وہ پھر اپنی الجھن اور مجروح جذبات شراب کی تلخی میں ڈبو دینا چاہتا تھا۔

وہی پرانی ٹوٹی ہوئی کرسیاں اور گندے میزوں پر خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ پہلے ہی سے وہاں بیہوش پڑے ہوئے تھے۔ کچھ بے ہوش ہو رہے تھے اور کچھ اناپ شاپ بک رہے تھے۔ جب ماتھر ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا۔ اس کو کامنی یاد آگئی وہ انتظار کر رہی ہوگی۔ لیکن دوسرے لمحے لوائے نے اس کے میز پر شراب رکھ دی۔ سرخ شراب۔ اُبلتے ہوئے اس شراب کی سرخی میں اُس کو سریتا کے لال ہونٹ نظر آئے اس نے جلدی جلدی پیگ کو ہاتھ میں لے کر جام پر جام پینے شروع کئے۔ جذبات کے خون کا بدلہ شراب سے لے رہا تھا جو بہک گیا تو کہنے لگا۔

"اس کے سرخ ہونٹ نہ چوم سکا، تھوڑی دیر کے لئے اس کے لب سے شراب نہ پی سکا لیکن وہ کیا سمجھتی ہے؟ میں شراب پی لیتا ہوں اس کے ہونٹوں کو چوم لیتا ہوں۔ پی لوں ..... ہاں .... پی لوں۔"

وہ بہک گیا، بہت زیادہ بہک گیا۔ بھلا ہو اس شراب کا جو تلخ ہوتی ہے لیکن تلخی میں بھی زندگی کو خواب ناک بنا لیتی ہے۔ لیکن حقیقت پھر

بھی حقیقت رہی ہے۔ وہ اپنی ٹوٹی کرسی سے اٹھا اور گرد نظر ڈالی۔

پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

"چل بیٹے آج تو بہک گیا ہے۔ لیکن مایوس نہیں ہوا اور مایوس جس دن ہوگا، اس دن تو سنجیدہ بنے گا۔ اور جس دن تو سنجیدہ ہوگا۔ اس دن تو مر جائے گا۔"

بہکتے ہوئے قدم اور بہکتی ہوئی آواز کے ساتھ وہ شراب خانے سے وہ باہر نکلا۔ وہ کہتا رہا۔

"اس دن تو مر جائے گا۔ ہاں مر جائے گا۔"

اماوس کی رات تھی ہر طرف تاریکی تھی۔ ماتھر کو کچھ نظر نہیں آتا تھا وہ بڑبڑایا۔

"میں کیسے گھر پہنچ جاؤں؟"

وہ بہکتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ وہی جانی پہچانی راہیں تھیں لیکن آج یہ سب راہیں اس کے لئے اجنبی تھیں۔ اجنبی بن کے وہ ان راہوں کو ٹٹول رہا تھا۔ وہ مایوس نہیں تھا۔ وہ مایوس نہیں ہوگا وہ راستے کو ہنستے کھیلتے ڈھونڈنے لگا لیکن وہ کیسے سریتا کو منائے گا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایک لمبی آہ کھینچ لی۔

"ہائے سریتا ـــ پیاری سریتا۔"

لیکن دوسرے لمحے اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی وہ مسکراتا تھا کہ اس کو اپنے گھر کا دروازہ نہیں ملتا تھا۔ وہ دروازہ جس سے وہ کئی

سال داخل ہوتا رہا۔ اور باہر آتا رہا۔ لیکن آج وہ ہی دروازہ وہ بھول گیا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔

لیکن آخر اس کو اپنا دروازہ مل گیا۔ وہ سیدھی راہ پر آگیا۔ دروازہ کھول لیا اپنے گھر کے آنگن میں، وہ چیخنے لگا۔ کامنی ـــ میری بہن کامنی ـــ کامنی۔"

لیکن جس کو وہ چیخ سمجھتا تھا وہ آواز دوسرے کے کان میں نہیں پہنچی۔ گرمی شدت سے بڑھ رہی تھی آواز حلق سے نہیں نکلتی۔ ماتھر کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے لباس کو تار تار کر دے۔ جسم کے انگ انگ کو سردی سے تر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سردی کہاں ہے۔ اس کا جسم آگ کا انگارہ ہے وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔

"کب یہ سرد ہو گا۔"

اس نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہی سنسان کمرہ خوف اور ڈر کہاں تک وہ خوف اور ڈر میں رہے گا۔ زندگی اور زندگی سے خوف اور ڈر نکالنا ہی پڑے گا۔

دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔

وہاں کامنی تھی ـــ نیند کے آغوش میں ـــ حالات سے بے خبر ایک سوئی ہوئی جوانی تھی۔ زندگی کا پُر خمار خواب تھا یا حقیقت۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اس کے چہرے پر موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔

گرمی شدت سے پڑ رہی تھی۔

اور دوشیزہ سوئی ہوئی تھی۔

سینے کا کچھ حصہ عریاں تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ماتھر نے چادر سنبھالی۔ اس کے جسم کو ڈھانپنے کے لئے لیکن جب چھاتیوں کے قریب پہنچا۔ وہی نیم عریاں چھاتیاں۔ اس کو سریتا یاد آئی۔ تیزی کے ساتھ ایک خیال نے اس کو اپنی گرفت میں لیا۔ وہ چاہتا تھا —— ہاں وہ —— چاہتا تھا۔

"ایک بار صرف ایک بار وہ کامنی کو اپنے بازوؤں میں کس لے اس کی چھاتیوں کو بے تحاشا چوم لے۔"

دوسرے لمحے وہ چیخ پڑا۔

"نہیں۔"

اور زندگی میں وہ پہلی بار سنجیدہ ہو گیا ؞

⁂ ⁂ ⁂

جب وہ نغمہ چھڑتی ہے

کچھ چیزیں یاد رکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ کیونکہ کبھی کبھی وہ چیزیں انسانی زندگی میں غیر معمولی تبدیلی لاتی ہیں۔ ایک ایسی تبدیلی جو زندگی میں نئی قسم کی ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔

رینو کا دیوی کی شاندار پارٹی کبھی بھی سادھیر نہیں بھول سکتا ہے رینو کا دیوی ایک مالدار بیوہ، ادھیڑ عمر کی عورت تھی چند سال پہلے اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا۔ لیکن اس مالدار عورت کا کوئی بھی بیٹا نہیں تھا۔ جو اتنے بڑے کام کو سنبھال لیتا۔ اس لئے کاروبار کے سب کام اس کو خود دیکھنا پڑتے تھے۔ سادھیر اس کے کارخانے میں ملازم تھا اس شاندار پارٹی میں اس کی مالکن نے اس کو شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ رینو کا دیوی کا ماضی کچھ روشن نہ تھا۔ کہتے تھے کہ وہ آوارہ تھی عمر کے ساتھ ساتھ وہ ماضی کے داغوں کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن

لوگ اس کے ماضی کو بھولنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بے تحاشہ دولت اس کا ماضی لوگوں کو بھلا نہ سکی۔ یہ سچ ہے کہ وہ ایک رحمدل عورت ہے۔ کبھی کبھی سدھیر اس عورت کے بارے میں غور سے سوچتا تھا سوچتا تھا کہ کیا کبھی اس رحمدل عورت نے ایسے دن بھی گذار دیئے ہوں گے۔ جن کا تصور کر کے بھی وہ کانپ اٹھتا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کے خیالات ایک مدھر راگ نے منتشر کر دیئے یہ آواز ایک دلفریب آواز تھی یہ ایسا نغمہ تھا جس کی وجہ سے وہ تھوڑی دیر کے لئے ارد گرد کی دنیا کو بھول گیا وہ ایک حسین لڑکی کے سامنے کھڑا تھا جس کا ہاتھ تیزی کے ساتھ پیانو پر چلتا رہا۔ اس حسین لڑکی کی آواز میں لوچ اور اثر تھا ایک ایسا اثر جو نوجوان دلوں کو پگھلا دیتا ہے۔ وہ آواز نوجوان دلوں میں درد پیدا کرتی ہے۔ اس کے نغمے نے سدھیر کو سرور بخش دیا وہ سرور ایک ایسا سرور تھا جس میں انسان کھو کر ہوش پانے کی کبھی خواہش نہیں رکھتا ہے وہ اس قدر لڑکی میں کھو گیا کہ وہ اس کے جسم کے ہر مناؤ کا غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی ہر ادا میں جوانی کی بجلی چھپی ہوئی تھی اس کی مالکن نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا:

"سدھیر کیا دیکھتے ہو۔"

وہ اپنی مالکن کے اس سوال پر قدرے گھبرا اٹھا۔ ایک گھبراہٹ جس میں شرم و حیا کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ وہ اس لئے بول اٹھا۔

"جی! کچھ نہیں۔"

رینو کا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:
"نوجوان نگاہیں کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ آؤ میں تم کو اس لڑکی سے ملا لوں۔" وہ قدرے شرما گیا۔ لیکن اس بات سے پوری طرح باخبر تھا کہ رینو کا ایک دقیانوسی نظریات کی عورت نہیں ہے۔ وہ خود جدید فضا میں پل کر جواں ہوا ایک ایسی فضا میں جو کہ دقیانوسی پابندیوں کو ہمیشہ کے لئے مٹا دینا چاہتا ہے۔ یہ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ حیا کے لبادے کو پھینک کے اس حسین لڑکی سے متعارف ہونے کا ضرور خواہشمند تھا۔ اس لئے وہ رینو کا دیوی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ رینو کا دیوی نے لڑکی سے کہا "شالنی اس سے ملو۔ یہ میرے کارخانے میں کام کرتا ہے اس کا نام سدھیر ہے۔ ہاں کچھ تم دونوں باتیں کرو۔ میں دوسرے مہمانوں کو دیکھتی ہوں۔"

سدھیر ایسے موقعے پر سوچنے پر مجبور ہوا تھا۔ کہ رینو کا دیوی اس کی شفیق ماں ہے جو یہ نہ سوچتی ہے کہ وہ اس کے کارخانے میں ایک معمولی ملازم ہے۔ سچ مچ وہ ایک فراخدل عورت تھی۔ ایک ایسی عورت جس کے دل میں چھوٹے بڑے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ خیر اس وقت اس نے رینو کا دیوی کے بارے میں سوچنا بند کیا۔ اس نے شانتی سے کہا: "آپ نے جو غزل گائی وہ سچ مچ دلوں میں ایک اثر پیدا کرتی ہے۔"
"شکریہ"

لڑکی کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔ ایک ایسا تبسم جس میں وہ کھو جانا چاہتا تھا۔ سدھیر سوچتا تھا۔ کہ وہ کہاں سے اپنی محبت کا اظہار شروع کر دے پارٹی اختتام پر آنے والی تھی۔ تب سدھیر نے شالنی سے کہا:

"آپ کہاں رہتی ہیں۔"

"میں نگینی باغ کے قریب رہتی ہوں۔"

"آئیے میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

"لیکن۔"

"آئیے نا۔"

وہ دونوں رینو کا دیوی سے اجازت لے کر ٹیکسی گاڑی میں سوار ہوئے، اس چھوٹے سفر میں وہ دونوں خاموش رہے۔ شاید ڈرائیور کی موجودگی ان کو خاموش رہنے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے چہرے کا حال پڑھ رہے تھے۔ نگینی باغ کے پاس ٹیکسی رک گئی، وہ دونوں نیچے اترے۔ سدھیر نے ٹیکسی والے کو پیسے دیئے۔ اور شالنی کے پیچھے چلنے لگا۔

شالنی نے یہاں ایک پرانے اور فرسودہ طرز کے مکان میں دو کمرے کرائے پر لئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ شالنی ایک غریب لڑکی تھی جب وہ اپنے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچی تو سدھیر نے اس سے کہا:

"اب مجھے اجازت دیجئے۔"

دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس پرانے پیار کا اظہار اسقدر جلدی سے کرے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اس طرح لڑکی بوکھلا اٹھے۔ اور اس کے پیار کا منصوبہ درہم برہم ہو جائے۔ وہ لڑکی کے قریب ہونا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کے طبعیت کے اتار و چڑھاؤ کو پرکھ سکے۔ وہ من ہی من میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ اچانک شالنی نے کہا۔

"اندر آجاؤ سدھیر۔"

اس آواز میں درد تھا ایک ایسا درد جس میں غربت کی تلخی موجود تھی۔ اس نے آگے کہا:

"میں جانتی ہوں سدھیر تم میرے اس چھوٹے سے کمرے میں آنا پسند نہیں کروگے۔ لیکن اس میں میرے ذوق انتخاب کا قصور نہیں ہے۔ میں ایک غریب اور یتیم لڑکی ہوں۔ میں ایک جوتے کی دوکان میں ڈیڑھ سو روپے کی معمولی تنخواہ پاتی ہوں۔ میں کیسے اپنے گھر کو سجا سکتی ہوں۔"

سدھیر نے شالنی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"شالنی اگر انسان کو روٹی کے دو ٹکڑے عزت سے مل جائیں تو وہ اس دولت مند آدمی سے بہتر ہے جو ناجائز طریقوں سے اپنی دولت کماتا ہے۔"

سدھیر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کی حالت دیکھ کر سدھیر نے محسوس کیا یہ لڑکی نہایت ہی غریب ہے۔ سدھیر سوچنے لگا کہ وہ ایک غریب لڑکی ضرور ہے۔ لیکن اس کے پاس صورت اور

سیرت کی دولت موجود ہے۔ وہ اس لڑکی کو دل کی گہرائیوں سے پیار کرنے لگا۔ وہ اس لڑکی کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگا۔ نہ جانے اس کی نیلی آنکھوں میں کیا تاثر تھا۔ کہ وہ ان میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ شالنی کے ہاتھ کام کرتے وقت نہایت تیزی سے چلتے تھے۔ اُس نے چائے کے دو کپ بنائے۔ اُس نے ایک کپ سدھیر کے سامنے رکھا۔ سدھیر نے اُس سے سوال کیا۔

"شالنی تم ایک غریب لڑکی ہو اور وینو کا دیوی ایک امیر عورت۔ پھر اُس کا اور تمہارا کیا سمبندھ ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔" شالنی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا "وینو کا دیوی ایک نہایت رحم دل عورت ہے۔ وہ ایک دن اُس جوتے کی دوکان پر سینڈل خریدنے کے لئے آئی۔ جہاں میں کام کرتی ہوں۔ میں اس کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آئی۔ کیونکہ ہر ایک کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا سیلز گرل کا پیشہ ہی ہے۔ وہ میرے سلوک سے متاثر ہوئی۔ اب آج اس نے مجھے دعوت پر بلایا۔" سدھیر نے اس اثنا میں چائے کا کپ ختم کیا۔ اور وہ جانے کے لئے تیار ہوا سدھیر نے کہا۔ "اچھا شالنی اب میں جاتا ہوں۔" اس نے اُٹھتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہاں ملو گی"

شالنی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کل نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پرسوں میں چھ بجے گھر پر ہی انتظار کروں گی۔" دروازے سے نکلتے ہوئے سدھیر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں پرسوں ملنے آؤں گا۔"

سدھیر جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ اُس کے پاس ایک لمبا چوڑا منصوبہ تھا۔ ایک ایسا منصوبہ جس کے ساتھ اُس کی زندگی وابستہ تھی۔ جاتے وقت اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"شب بخیر"

"شب بخیر"

شالنی کی مدھر آواز نے اس کے دل و دماغ کو معطر کر دیا پھر وہ اُسکو ایک بار نہیں دس بار ملا۔ لیکن سدھیر پیار کی منزلیں ایک ساتھ پار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ دس ملاقاتوں کے بعد وہ ایک پیار کا بوسہ حاصل کر سکا۔

وہ گھنٹوں ایک ساتھ باتیں کرتے تھے۔ تب کبھی کبھی شالنی کہتی۔

"سدھیر میں چاہتی ہوں کہ مجھے ایک چھوٹا مگر صاف و شفاف گھر دستیاب ہو۔ یہ سب حاصل کرنے کے بعد میں دلہن ... رونق شہر کو بمبئی کے میرین ڈرائیور کو۔ کلکتہ کے

وکٹوریہ میموریل کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے ان جگہوں کو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ لیکن یہ سب میں کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ یہ سب دیکھنے کے لئے مجھے دولت کا انبار چاہئے تھا۔

لیکن سدھیر اس کو گلے لگا کر کہتا۔ "نہیں شالنی غریب لوگ ایسے خواب نہیں دیکھتے ہیں۔ وہ ایسے خواب دیکھ کر راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔"

لیکن شالنی کو ان تہذیب یافتہ شہروں کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ یوں تو وہ دنیا کے کونے کونے کو دیکھنے کی تمنا رکھتی تھی۔ نہ جانے اُس میں یہ جنون کیوں پیدا ہُوا۔ ایسے جنون اکثر خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ ایک شام جب سدھیر اپنی پیاری محبوبہ کے لبوں پر پیار کا بوسہ چسپاں کر رہا تھا کہ اچانک شالنی کے بازو اُس کے ارد گرد مضبوط ہوئے۔ سدھیر کے جذباتوں میں آگ لگ گئی۔ ایک ایسی آگ جس نے دونوں کو بہا کر لیا۔ پھر وہ جب ہوش میں آئے۔ تب شالنی نے سدھیر سے کہا۔

"اب تم چلے جاؤ اور مجھے اکیلی چھوڑ دو۔"

سدھیر اس کو سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ اس کو کہنا چاہتا تھا۔ کہ وہ اس مقام پر اس قدر تیزی کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ کچھ سننے کے لئے تیار ہی نہیں تھی۔

شالنی کے چہرے پر نفرت کی لکیریں گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ ان لکیروں سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ شالنی کو کھوئے۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ شالنی اس سے روٹھ جائے۔ وہ سمجھ بیٹھا کہ شالنی اُس سے بہت دُور چلی گئی۔ وہ جس منزل کی آس لگا بیٹھا تھا۔ وہ منزل کھو گئی۔ لیکن اُس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ شالنی سے جب وہ اس کے بعد ملنے گیا۔ وہ اس سے گرم جوشی سے ملی۔ اُس کا اندازہ ایسا تھا۔ کہ جیسے کل کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ وہ دونوں جواں تھے اور اپنے اندر جوان دل رکھتے تھے۔ ایسے دل ہر وقت جذبات کے ہاتھوں کھلونے بن کے رہ گئے۔ لیکن ہر بار شالنی کے چہرے پر ایسے واقعات کے بعد نفرت کی لکیریں اور بھی گہری ہوتی چلی گئی۔ شاید اُس کو یہ سب شادی سے پہلے پسند نہ تھا۔ شاید وہ اپنے محبوب سے قانونی اور سماجی بندھنوں سے پہلے ایسے تعلقات پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سدھیر ایسے لمحات پر اُس کی یہ حالت دیکھ کے بڑے گہرے سوچ میں پڑ جاتا تھا۔ اُس نے آخر فیصلہ کیا۔ وہ اس زندگی سے باہر آئے اس لئے اس نے شالنی سے کہا۔

"شالنی اب ہم دونوں کو شادی کرنی چاہیے"۔

سدھیر کا خیال تھا کہ شالنی یہ خبر سُن کے خوشی سے اُچھل

پڑے گی۔لیکن شالنی نے ایسا نہیں کیا۔اس کے چہرے پر خوشی رقصاں نہ ہوئی۔اس کی آواز میں جوش پیدا نہ ہوا۔اس نے سدھیر سے کہا۔

"مجھے سوچنے کے لئے وقت دو"

سدھیر اُسے سوال کرنا چاہتا تھا۔کہ وہ آخر کیا سوچنا چاہتی ہے۔کہ شالنی کو کس چیز کے لئے غور کرنا تھا۔لیکن اس نے کچھ نہ کہا وہ خاموش رہا۔اور اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔لیکن جب وہ اس کا جواب پوچھنے گیا۔تو اس نے اس کو غائب پایا۔اس نے اس فرسودہ مکان کے کمرے چھوڑ دیئے تھے۔

"لیکن وہ کہاں چلی گئی تھی۔" وہ اپنے آپ سے یہی سوال پوچھتا رہا۔یہی سوچتے ہوئے وہ اس جوتے کے دوکان میں بھی گیا۔جہاں شالنی کام کرتی تھی۔لیکن اس نے وہ نوکری بھی چھوڑ دی تھی۔سدھیر مایوس ہوا۔وہ اپنے دل کے سکون کو اس آسانی سے کھونے کو تیار نہیں تھا۔جس کے ایک نغمے نے اُس کی زندگی کو ایک نیا سُرور بخش دیا۔وہ اس کے نغمے میں ہمیشہ کے لئے مدہوش ہونا چاہتا تھا۔سدھیر شالنی کو ڈھونڈتا رہا۔اور ڈھونڈتے ہوئے وہ رینوکا دیوی کے پاس پہونچ گیا۔اس نے رینوکا دیوی سے کہا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ شالنی کہاں چلی گئی۔"

دیبو کا دیوی نے صاف صاف جواب دیا۔ کہ اس کو شالنی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ یہاں سے وہ مایوس لوٹ کر پھر ایک بار شالنی کے مکان پر گیا۔ لیکن یہاں اس کو سنسان کمروں کے بغیر کچھ نہ ملا۔

وہ ہر گھڑی کے بعد زندگی سے مایوس ہوتا چلا گیا۔ لیکن اچانک اس کو شالنی کے کرایہ کے مکان کا مالک ملا۔ اس مکان کے مالک سدھیر کے لئے خطرہ ثابت ہوا۔ ایک ایسا خطرہ جس نے اسکو بتایا:۔

"تم لڑکی کو ڈھونڈ رہے ہو نا"

"ہاں"

"میرے خیال میں وہ گلاب باغ کے کسی مکان میں رہتی ہے۔"

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ اس لئے سدھیر دوڑتا ہوا۔ گلاب باغ پہنچ گیا۔ اس کو ضرور شالنی کا فلیٹ ڈھونڈنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ بہت جلد اُس کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوا۔ شالنی ایک اچھے فلیٹ میں رہتی تھی۔ وہ حیران ہوا۔ کہ اس میں یہ غیر معمولی تبدیلی کیوں اور کیسے پیدا ہوئی۔ وہ اس کو پکارتے ہوئے داخل ہوا۔

"شالنی۔ ۔ ۔ ۔ شالنی۔"

شالنی نے اس کو دیکھ کر حقارت سے کہا۔

"تم چلے جاؤ۔ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ تم یہاں سے چلے جاؤ میں تم سے ملنا نہیں چاہتی ہوں"

سدھیر سمجھا شاید وہ اس سے روٹھ گئی ہے۔ اس لئے اس نے کہا۔ "میری پیاری شالنی تم ناراض کیوں ہو۔ کیا بات ہے۔"

شالنی نے پھر ایک بار احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "تم چلے جاؤ سدھیر۔ بھول جاؤ وہ سب کچھ وہ دن جو ہم نے اکٹھے گذارے تھے۔ وہ تو ایک کھیل تھا۔ جو ختم ہوا۔

سدھیر حیران ہوا کہ اس شالنی کو کیا ہوا ہے۔ آخر شالنی اس قدر کیوں بدل گئی۔ اچانک اس کی نظر شالنی کے پیٹ پر پڑھ گئی۔ وہ چیخ پڑا۔

" او۔ تم حاملہ ہو۔ اس لئے مجھ سے چھپتی رہی لیکن پگلی۔ تم مجھے غلط سمجھی۔ ہاں وہ میرا بچہ ہے۔ وہ ہمارا بچہ ہے۔"

اچانک شالنی نے سنجیدہ آواز میں کہا۔ "نہیں سدھیر وہ ہمارا بچہ نہیں ہے۔ ہاں وہ رینو کا دیوی کا بچہ ہے۔"

نہ جانے اس لمحے سدھیر کو شالنی کا وہ چہرہ کیوں یاد آیا جس میں نفرت کی لکیریں گہری ہوتی تھی۔ شاید اس کو اس وقت

یاد آتا تھا۔ کہ وہ یہ کام رینو کا دیوی کے لئے کر رہی تھی۔ سدھیر نے ڈوبی ہوئی آواز میں شالنی سے پوچھا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

شالنی نے گہری لیکن سنجیدہ آواز میں کہا۔

"ہم دونوں غریب ہیں۔ میرے پاس نہ ایک چھوٹا اور صاف تسقاف مکان ہے۔ نہ تمہارے پاس وہ چھوٹا مکان ہے۔ میں دُنیا دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے دُنیا نہیں دکھا سکتے ہو۔ ان سب چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے دھن چاہیے۔ وہ دھن میں اس بچے سے حاصل کر سکتی ہوں۔ رینوکا دیوی کو ایک بچہ چاہیے۔ ماضی کے کرتوتوں نے اس کو اس قدر بدنام کر کے رکھا کہ کوئی بھی یتیم خانہ اُس کو بچہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس لئے وہ میرا بچہ چاہتی ہے۔ اُس نے ہم دونوں کو اِسی لئے ملایا۔ ہم اُس کے لئے ایک بچے کو پیدا کریں۔ اور مجھے اس بچے کے عوض بیس ہزار ملیں گے۔ میں ایک فلیٹ بھی خرید سکتی ہوں۔ میں دُنیا کو بھی دیکھ سکتی ہوں۔ جس کو دیکھنے کے لئے میرے دل میں ایک گہری تمنا ہے۔

سدھیر حیران ہُوا۔ یہ عورت ہے۔ یہ ماں ہے۔

نہیں یہ ماں نہیں ہے۔ یہ عورت نہیں ہے۔

یہ دھن کی پرستار ایک بے جان مورتی ہے۔

"آخر اس دُنیا کو ہُوا کیا ہے جو دھن کے پیچھے دوڑتی ہے۔"

وہ سوچتا تھا۔ لیکن اس کے سوچ سے یہ چیزیں تبدیل نہ ہو سکی۔ یوں تو اس نے شالنی کو ڈرایا دھمکایا۔ کہ وہ اس بچے کو چند روپوں کے لئے اگر فروخت کرے گی۔ تو وہ اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کرے گا۔ لیکن شالنی نے صاف کہا۔

"تمہارے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے۔ کہ تم یہ ثابت کر سکو کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔" وہ لاجواب ہو کے رہ گیا۔

سدھیر اس کو نرمی سے سمجھاتا رہا۔ لیکن وہ کوئی بات سمجھنے کے لئے تیار ہی نہ تھی۔ وہ اس کو سمجھاتا رہا۔ وہ نہ سمجھ سکی۔ اس کو شالنی سے نفرت ہو گئی۔ وہ شالنی کے نام سے بھی نفرت کرنے لگا۔ لیکن وہ ایک بار اس بچے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جو اُن کے بھولے ہوئے پیار کی نشانی تھی۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے اس شہر کو خیرباد کرنا چاہتا تھا۔ ہاں وہ اُس دن ہسپتال گیا۔ جس دن شالنی نے بچے کو جنم دیا

شالنی نے بچے کو جنم دیا۔ لیکن وہ بچہ مردہ پیدا ہوا۔

شالنی بیس ہزار روپئے حاصل نہ کر سکی۔ وہ ایک چھوٹا سا مکان حاصل نہ کر سکی۔ وہ بمبئی۔ کلکتہ دہلی نہ جا سکی۔ لیکن وہ سوچتا رہا۔ شالنی اب کون سا نغمہ چھیڑے گی۔

* * *

ہڑتال

منورام یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بمبئی کو پُر رونق بنانے میں فلمی دُنیا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جب بھی وہ اسٹوڈیو جاتا تھا۔ تو وہ یہ سوچتا تھا کہ اگر کبھی فلمی دُنیا نے ہڑتال کی تو بمبئی کا کیا حال ہوگا؟ کہاں تک اس پُر رونق شہر کی رونق میں پھیکا پن پڑ جائے گا۔

آخر کیا ہوگا؟

جب بھی وہ میرین ڈرائیو، چرچ گیٹ اور باندرہ کی سڑکوں پر چلتے ہوئے رُک جاتا تھا تو لوگوں کو ہر جگہ فلمی ستاروں کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے پاتا تھا۔ اکثر ان تبصروں کا فلمی دُنیا کے نت نئے سکینڈل کے ساتھ تعلّق ہوتا تھا۔ یوں تو فلمی ستاروں کے ان ہی سکینڈلوں سے فلمی دُنیا جواں تھی۔ منورام یہ سوچتا تھا کہ

سڑکوں پر اور گلیوں میں جو لوگوں کے جھرمٹ جمع ہوتے ہیں۔ ان کے لئے فلمی ستاروں کے سکینڈلوں پر تبصرہ کرنا مشغلہ کا کام دیتا تھا۔ منورام یہ بھی سوچتا تھا کہ اگر کبھی فلمی دنیا نے ہڑتال کی تو ان لوگوں کے مشغل کے سامان کا کیا ہوگا؟۔ تب کیا ہوگا؟

تب منورام کے لئے ایک سوال تھا۔ یہ تب اس وقت بھی منورام کے لئے تھا۔ جب کہ وہ انبالہ سے یہ اُمید لے کر بمبئی روانہ ہوا تھا کہ کبھی وہ ہندوستانی دنیا کا بہت بڑا اداکار بنے گا۔

"تب کیا ہوگا؟"

وہ یہی سوچتے ہوئے بمبئی پہنچ گیا تھا۔ پہلے تو چند دنوں گھر اور اسٹوڈیو کا راستہ ناپتا رہا کہ کبھی وہ بڑا اداکار بنے گا۔ لیکن اسٹوڈیو کے چوکیدار کی مدد سے وہ ایک اداکار سے ایک ایکسٹرا ضرور بن گیا تھا۔ جس کو ہر دن دس روپے ملتے تھے۔ بمبئی کی رنگین دنیا اُس کے لئے صرف ہر دن دس روپے مہیا کر سکی۔ لیکن اب بھی منورام خواب کی دنیا میں رہتا تھا کہ کبھی نہ کبھی اداکار نہ سہی لیکن ہدایت کار وہ ضرور بنے گا۔

لیکن اس وقت اسٹوڈیو جاتے ہوئے وہ ایک ہی بات سوچتا تھا کہ اگر فلمی دُنیا نے ہڑتال کی تو اُس کو دس روپے کہاں سے ملیں گے۔ وہ ہر دس کے نوٹ کے بعد دوسرے دس کے نوٹ کی انتظار میں رہتا تھا۔ اُس نے اسٹوڈیو کو بند پایا۔ بمبئی

میں پہلی بار اُس کو اپنے دس کا نوٹ ڈوبتے ہوئے نظر آیا۔

اسٹوڈیو کے باہر اسٹوڈیو میں کام کرنے والے لوگ جمع تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈے اور کاغذ کے بورڈ تھے۔ ان لگتے کے بورڈوں پر لکھا تھا۔

"فلم سینا اپنی مانگوں کو منوا کے رہے گی۔"

"یہ ظلم اب برداشت نہیں کیا جائے گا۔"

فلمی دُنیا کی ہڑتال شروع ہوئی۔

منو رام پتھریلے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ پروڈیوسروں اور ڈسٹری بیوٹروں کے جھگڑے میں کیا غریب مزدور پسا جائے گا۔

ہاں غریب کا کام ہی ہے کہ وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر امیروں کے لئے ہڑتال کرے اُس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ فلمی اسٹوڈیو ویران نظر آئے گا۔ جہاں کل تک راہ گیر داخل ہونے کے لئے ترستے تھے۔ اب وہی راہ گیر اس اسٹوڈیو کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے جیسے کبھی وہاں کوئی رنگین دُنیا آباد ہی نہ تھی۔ منو رام بھی ہڑتال کے جلوس میں شریک ہوا۔ ہڑتال کا یہ جلوس بمبئی کی شاندار سڑکوں پر نعرے لگاتے ہوئے اور سنیما بند کرتے ہوئے جناح ہال پہنچ گیا۔ چند لوگ بھی اس جلوس میں شامل ہوئے۔ یہ لوگ اُن فلمی ستاروں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ جن کا سکینڈل ان

کے لئے شغل تھا۔ لیکن ان لوگوں نے بھی چند دنوں کے بعد ان کا ساتھ
چھوڑ دیا۔

لیکن اس شاندار جلوس نے منورام کو دس روپے کا نوٹ
نہ دیا۔ اُس کو بھوکی پیٹ نے بہت ستایا۔ اتنا ستایا کہ رونے لگا۔
اس کو ہر لمحے کے بعد وہ اسٹوڈیو میں ہر وقت اس طاق میں رہتا
تھا کہ کب مایا کماری کی لمبی موٹر کار آئے اور وہ اس کا دروازہ
کھولے اور کئی بار وہ مایا کماری کا دروازہ کھولنے میں کامیاب
ہوا۔ نہ جانے اُس کے دل میں مایا کماری کے لئے کیوں ایک عجیب
جذبہ تھا۔ لیکن مایا کماری نے اُس کے جذبے کی قدر نہ کی۔ اُس
نے کبھی اُس پر ایک غلط نگاہ بھی نہ ڈالی۔

آج منورام اُس کے پاس جائے گا۔

وہ سوچتا تھا کہ شاید مایا کماری کو یاد ہوگا کہ کبھی اُس نے
اُس کی موٹر کار کا دروازہ کھولا۔ شاید وہ اس کی بھوکی پیٹ
کی مدد کر سکے۔

منورام نے مایا کماری کے جدید فلیٹ کے دروازے کی
گھنٹی دبائی۔ مایا کماری کی نوکرانی نے دروازہ کھولا۔ منورام
نے کہا۔

"مایا کماری سے کہیے کہ منورام آپ سے ملنے آیا ہے۔ وہی
منورام جو اسٹوڈیو میں اُس کی کار کا دروازہ کھولتا ہے۔

نوکرانی یہ سُنکے چلی۔ کچھ ہی اتنا دس کے بعد واپس آئی۔ اُس نے منو رام سے کہا

"آ سیئے"

منو رام کو یقین نہ آیا کہ ہندوستان کی ایک مایہ ناز اداکارہ نے اُس کو اپنے فلیٹ میں اندر آنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس لیے وہ دوڑتے ہوئے فلیٹ میں داخل ہُوا۔ کہیں ہندوستان کی اس مایہ ناز اداکارہ کا خیال تبدیل نہ ہو جائے۔ مایا کماری ایک بہترین صوفے پر آرام رنجہ تھی۔ مایا کماری نے منو رام کو دیکھ کر کہا۔

"آؤ آؤ منو رام۔ دس دن سے میں کسی کا منہ دیکھنے کے لئے ترستی ہوں لیکن نہ آجکل کوئی ٹیلیفون کرتا ہے نہ ہی کوئی آدمی ہمارے فلیٹ پر چکر لگاتا ہے۔ نہ جانے فلمی ہڑتال کے ساتھ ساتھ ہم کو بھی لوگ کیوں بھول گئے۔"

منو رام اُس کو اب اپنی داستان سنانے والا تھا۔ ایک ایسی داستان جہاں بھوکی پیٹ کے صرف تذکرے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی داستان شروع کرتے۔ مایا کماری نے منو رام سے کہا۔

"منو رام! پھل کھاؤ۔"

منو رام مایا کماری کو دیکھکر یہ بھول گیا کہ اس کے سامنے

میز پر پھلوں کی طشتری تھی۔ وہ تو مایا کماری کے پاس اپنی بھوک کی پیٹ لیکر ہی آیا تھا۔ اُس نے پھل کھانے شروع کئے۔ مایا کماری نے منورام سے کہا

"منورام لوگ بہت جلد تبدیل ہوتے ہیں"

"ہوتے ہیں۔" منورام نے پھل کھاتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا۔ جیسے یہ پھل اُس سے اس لئے ملے تھے کہ وہ مایا کماری کی ہر بات کے لئے اقرار میں سر ہلائے

مایا کماری نے کہا۔

"اب دیکھو نا۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ تم بھی مجھے نہیں پہچان لوگے۔"

"میں آپ کو نہیں پہچان لیتا۔" منورام نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ کیا میں ہندوستان کی مایہ ناز اداکارہ کو نہیں پہچان لیتا جس کے در پہ بیسیوں پروڈیوسر ہر روز جھکا لگاتے ہیں۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" مایا کماری نے پلاسٹک تاش کو میز پر سے ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ بات اُن دنوں کی ہے جب ہڑتال نہیں ہوئی تھی۔ جب کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ فلمی دنیا بند ہو جائے گی۔ جیسے اب سب کو یقین ہوا ہے کہ فلمی دنیا کبھی نہ کھلے گی۔"

منورام کو محسوس ہوا کہ جیسے مایا کماری اپنے شاندار ایئر کنڈیشنڈ فلیٹ نئے ماڈل کی موٹر کار یہاں تک کہ عمدہ شراب سے بھی ہاتھ دھو کہ اُس سے التجا کرتی ہے کہ اس کو سر ڈھانپنے کے لئے اپنے چھت کے تلے جگہ دو۔

"کیا کبھی ایسا وقت آئے گا۔"

اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا لیکن اس سوال کو حل کرنے سے پہلے ہی مایا کماری نے اس سے کہا۔

"منورام اپنا تاش اٹھاؤ۔"

منورام حیران ہوا۔ وہ حیران ہوا کہ یہ جملہ مایا کماری کے منہ سے نکلا۔ کیا فلمی ہڑتال اس قدر آدمی کو تبدیل کر سکتی ہے اُس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"جی ہیں"

"ہاں — ہاں"

اُس نے تاش کی پتیاں سنبھالی۔ مایا کماری نے تاش کے پتے سجاتے ہوئے کہا۔

"کل تک جو پروڈیوسر میرے فلیٹ پر چکر لگاتے ہوئے نہ تھک جاتے تھے۔ آج کل ان کو ٹیلی فون پر بھی ہم سے بات کرنا گوارا نہیں ہوتا ہے۔ اُن کے گھر والے کہتے ہیں کہ صاحب میٹنگ پر گیا ہے یا صاحب میٹنگ کے لئے ڈرافٹ بنا رہا ہے۔ ہم سے نہ ملنے کے

رجیلے وبہانے ڈھونڈتے ہیں۔ نیل کو تم جانتے ہو نا!"

"جی ہاں ــ اچھی طرح جانتا ہوں"

نیل کو چار سال آئے ہوئے ہو گئے تھے۔ اُس نے دو تین فلموں میں کام کیا تھا۔ اس لئے اب وہ سیکنڈ کلاس اداکار مانا جاتا تھا۔

مایا کماری نے منورام سے کہا۔

"میں پرسوں اُس کے گھر گئی تھی۔ اُس سے کہا۔ چلو نیل کلب تک چلیں۔" لیکن اُس نے یہ بتایا کہ اس کو بیوی کے ساتھ کہیں جانا ہے۔ جیسے ان لوگوں کو یقین ہوا کہ فلمی دُنیا اس ہڑتال کے ساتھ ہمیشہ کے لیے بند رہے گی۔"

اس اثناء میں مایا کماری کی نوکرانی نے شراب کے دو پیگ میز پر رکھے۔ مایا کماری نے منورام سے کہا۔

"منورام اپنا پیگ سنبھال لو۔"

"میں" منورام نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"ہاں منورام بھول جاؤ۔ سب کچھ بھول جاؤ۔ جس طرح ہم سب کچھ بھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

اب منورام حیرانگی کے سمندر میں ہچکولے کھانے لگا۔ ایک بار پھر وہ یہ سوچنے لگا کہ اس فلمی ہڑتال نے سب کچھ تبدیل کیا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اب ہمیشہ کے لئے فلمی دنیا بند ہو جائے

اور وہ اسی طرح مایا کماری کے ساتھ تاش کھیلتا رہے اور ایک ایسی ہی فضا میں جہاں مایا کماری مایا کماری نہ ہو۔ جہاں منورام، منورام نہ ہو۔ لیکن پھر مایا کماری کی آواز اس کے خیالات میں دخل انداز ہوئی۔ اُس نے کہا۔

"وہ ستیش ہے نا جس نے صرف ایک فلم میں کام کیا ہے جو ہر وقت اس کوشش میں رہتا تھا کہ میرے ساتھ فوٹو کھنچوائے۔ آج اُس کو اچانک یاد آیا ہے کہ اُس نے ایم۔ اے انگلش میں پاس کیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کبھی دُنیا پائیگی وہ سمجھتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں پڑھا ہے اس لئے میں کوئی کام نہیں کر سکتی ہوں۔ لیکن نہیں فلمی دُنیا بند نہیں رہے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے منورام؟"

"میرا!"

وہ تو دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ فلمی دُنیا ہمیشہ کے لئے بند رہے۔ لیکن اُس چھوٹے ریڈیو نے جو مایا کماری کے بغل میں تھا، اس کی دعا رد کر دی۔

ریڈیو نے کہا کہ فلمی دُنیا کی ہڑتال ختم ہوئی۔ نہ جانے اس وقت منورام کیوں چیخنا چاہتا تھا۔ لیکن ہڑتال ختم ہوئی۔

اور مایا کماری اُس کے سامنے نہیں تھی۔ وہ شاید اُن

پرموڈ بوسروں کے پاس گئی جن کو چند لمحے پہلے کوستی تھی۔ اُس انیل اور سٹیفن کے پاس گئی ہو جن کو اس کے ساتھ چلنا چند گھنٹے پہلے گوارا نہ تھا۔ منورام اس بدلتی ہوئی حالت کو دیکھتا رہا۔ لیکن پھر بھی اس کو یقین تھا کہ مایا کماری اُس کو کبھی نہیں بھول جائے گی۔

دوسرے دن وہ اسٹوڈیو میں اُسی طاق میں بیٹھا ہوا تھا جہاں وہ ہر دن مایا کماری کی لمبی کار کا انتظار کرتا تھا۔ مایا کماری کی لمبی کار آجائے اور وہ اس کی موٹر کار کا دروازہ کھولے۔ مایا کماری کی موٹر کار آ بھی گئی بھی اور اس نے دروازہ بھی کھولا۔ لیکن مایا کماری نے اُس پر ایک نگاہ بھی نہ ڈالی۔ وہ مایا کماری منورام کو بھول گئی جس نے اُس کے ساتھ تاش کھیلا اور شراب پی۔ لیکن منورام بھی یہ بھول گیا تھا کہ یہ فلمی دنیا ہے۔

ﻻﻻ

یہ تہذیب یافتہ لوگ

گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہلن کا خاوند اب تک کارخانے سے واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی نوکرانی کام کاج کر کے اپنے گھر چلی گئی تھی۔ لنکن کالونی کے سارے لوگ سو گئے تھے۔ صرف اب ہیلن جاگ رہی تھی۔ ہیلن کا خاوند ایک موٹر کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اُس کا خاوند آجکل کارخانے میں فاضل وقت بھی کام کرتا تھا۔ تاکہ وہ اتنے ڈالر بنا سکے جو اس کے نئے مکان کے چھ فلیٹوں کے لئے فرنیچر خرید سکے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی بھی کرایہ دار اُن میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ ہلن اس وقت سوچ رہی تھی کہ چار پانچ مہینوں کے بعد اس کے نئے فلیٹ جدید قسم کے فرنیچر سے لیس ہو جائیں گے۔ پھر اُن کی ماہوار آمدن دو ہزار ڈالر ہوگی۔ نہ جانے اس کے بعد وہ کیا سوچنے

والی تھی کہ دروازے کی دستک نے اُس کو خیالوں کی دُنیا سے واپس لایا۔ ہیلن نے پاؤں میں چپل پہن لی اور خود سے کہا۔

"فرینک آگیا"

فرینک اُس کے خاوند کا نام تھا۔ یہی کہتے ہوئے وہ دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ وہ ہر وقت اپنے تھکے ہوئے خاوند کا استقبال ایک حسین مسکراہٹ سے کرتی تھی۔ اس لئے اُس نے اپنے چہرے پر ایک مسکراہٹ لائی اور دروازہ کھولا۔ لیکن اُس نے دروازے پر اپنے خاوند کو نہیں پایا۔ بلکہ وہاں اکیس سال کی ایک حسین لڑکی کھڑی تھی۔ جس کے باہنوں میں ایک نیا بچہ تھا۔ اس نے بچے کو اس طرح کمبل میں لپیٹ لیا تھا۔ اُس کو ۔

دوسرا آدمی دیکھ نہیں پاتا۔ ہیلن نے لڑکی کو دیکھ کر کہا۔

"آپ کو کیا چاہیئے؟"

لڑکی گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس کی آواز میں بھی گھبراہٹ نمایاں تھی۔ اُس نے کہا

"میں نے سنا ہے آپ کے نئے مکان میں فلیٹ کرایہ پر مل سکتا ہے۔"

ہیلن اس عورت کا چہرہ غور سے دیکھ رہی تھی جیسے کچھ

پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اُس کو اس لڑکی کے چہرے پر معصومیت کے بغیر کچھ اور نہ دکھائی دیا۔ ہیلن نے جواب دیا۔

"لیکن یہ فلیٹ ابھی جدید فرنیچر سے لیس نہیں ہیں۔ اور اس حالت ——"

لڑکی نے اس کی بات بیچ میں کاٹ لی۔

"مجھے ایسی ہی حالت میں ایک فلیٹ چاہیئے۔"

ہیلن کو پیسے چاہیئے کیونکہ اُس کو پیسے درکار تھے۔ اس لئے وہ فلیٹ کرایہ پر دینے کے لئے رضامند ہوئی۔ ہیلن نے اس لڑکی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو تین سو ڈالر کرایہ ماہوار دینے پڑیں گے۔"

"میں تیار ہوں۔"

اُس لڑکی نے اپنی قیمتی پرس سے کرایہ کے تین سو ڈالر بطور پیشگی دیئے۔ یہ کام کرتے ہوئے لڑکی نے بچے کو نیچے نہ رکھا نہ ہیلن کے ہاتھ میں دیا۔ حالانکہ ہیلن نے اس خیال سے اپنے ہاتھوں کو آگے بڑھایا۔ لیکن لڑکی کی مسکراہٹ نے اُس کو ٹال دیا۔ ہیلن نے اس رقم کی رسید بناتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"ریٹا"

ہلین نے رسید اُس کے ہاتھ میں سونپ دی اور اُس نے لڑکی سے کہا

"ریٹا — آؤ۔ میں تمہیں فلیٹ دکھاؤں گی۔"

ریٹا اُس کے پیچھے چلنے لگی۔ دوسرے مکان کی طرف جاتے ہوئے اُن کو فرینک ملا۔ ہیلن نے ریٹا کو فرینک سے ملاتے ہوئے کہا۔

"فرینک یہ ہماری نئی کرایہ دار ریٹا ہے۔" اور ریٹا کی طرف ہیلن نے کہا

"ریٹا یہ میرا خاوند فرینک ہے"

ریٹا اور فرینک نے ایک دوسرے کی خیریت و عافیت پوچھی اور ہیلن نے اپنے خاوند سے کہا۔

"فرینک میں ریٹا کو فلیٹ دکھاؤں گی۔ اور یہ کہکے ہیلن اور ریٹا نے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ ریٹا نے ہیلن کو فلیٹ دکھا کے کہا

"اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"بہت اچھا"

ہیلن جاتے ہوئے بھی اس لڑکی کا چہرہ غور سے دیکھ رہی تھی۔ جس کے ایک ہاتھ میں بچہ اور دوسرے میں چھوٹا سا

سوٹ کیس اور اُس کا پرس لٹک رہا تھا۔ ہیلن یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ اس لڑکی کے ساتھ شاید حادثہ پیش آیا ہے اس لیئے اس نے دوسرے دن ریٹا سے کہا۔

"ریٹیا تمہارا چہرہ سوجھا ہُوا کیوں ہے؟"

"نہیں تو . . . . . ایسی کوئی بات نہیں ہے" ریٹا نے اُس کی بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔ لیکن ہیلن کو اس کے جواب سے تسلّی نہ ہوئی۔ اب تو یہ لڑکی اس کے لیے معمہ بن گئی تھی۔ اُس کے اس معمے کو یقین میں تبدیل کرنے میں خود ریٹیا کا بھی ہاتھ تھا

ہیلن نے اُس سے کہا۔

"ریٹا بچہ میرے ہاتھ میں دو۔ ذرا میں بھی اس پیارے بچے کا مُنہ دیکھ لوں"

یہ سُنکے ریٹیا کانپ اُٹھی۔ اُس نے ہیلن سے صاف انکار کیا اور کہا۔

"میں اپنا بچہ کسی کے ہاتھ میں نہیں دیتی ہوں۔"

ریٹیا یہ کہتے ہی اپنے فلیٹ میں واپس چلی گئی۔ اس واقعے کے بعد ہیلن کے لئے ریٹیا اور کمبل میں لیٹا ہوا اُس کا بچہ اُس کے لئے معمہ بن گیا تھا۔ اس کے اس معمے کی شکار اس کی ہمسایہ عورت لوسی ہری بھی ہو گئی۔ یوں تو لوسی ہری

ایک رحم دل عورت تھی۔ اس کو بچوں سے بڑا پیار تھا۔ کیونکہ اُس کے اپنے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔ لوسی نے ہیلن سے کہا

"یہ جو تمہارے فلیٹ میں کرایہ دار رِٹیا رہتی ہے۔ اس نے اپنے بچے کو میرے ہاتھ میں دینے سے انکار کیا۔ بچہ کو ہاتھ میں دینے کا نام سُنتے ہی وہ کانپ اُٹھی۔ جیسے اُس کی کمبل میں بچہ نہ ہو بلکہ چوری کا مال ہو۔

پھر لوسی اچانک چیخ پڑی

"کہیں سچ مچ اُس کی کمبل میں چوری کا مال نہ ہو۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔"

ہیلن نے اُس کے شک کی تردید کی۔ لیکن اس تردید نے لوسی کے شک کو تبدیل نہیں کیا اور لوسی کی باتوں پر دوسرے ہمسائے بھی غور سے سوچنے لگے۔ اب رِٹیا سازی کالونی کے لئے ایک معمہ بن گئی تھی۔ جس معمے کو کوئی حل نہیں کر پاتا تھا نہ اس معمے کو حل کرنے کی کسی کو طاقت تھی۔ لیکن ہیلن نے من ہی من میں اس معمے کو حل کرنے کی ٹھان لی۔ اس لئے ایک دن وہ صبح ہی صبح رِٹیا کے فلیٹ میں گئی۔ اُس نے رِٹیا سے پھر ایک بار کہا۔

"رِٹیا میں تمہارے بچے کا ایک بار منہ دیکھنا چاہتی

ہوں۔ ذرا اس کو میرے ہاتھ میں دو۔"

"میں اپنا بچہ کسی کے ہاتھ میں نہیں دیتی ہوں۔"

"کیوں؟ — آخر کیوں؟"

" دیکھ ہیلن تمہارے فلیٹ کے تین سو ڈالر کرایہ میں نے دیئے ہیں اور اس کے بعد تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اب تم چلی جاؤ اور مجھے اکیلی چھوڑ دو۔"

ریٹیا نے ہیلن کو غلط سمجھا وہ ان پڑوسیوں کا منہ بند کرنا چاہتی تھی۔ جو اس کے بارے میں اناپ شناپ بکتے تھے۔ یوں تو ہیلن بھی اُس کے اس ناروا سلوک سے دل ملول ہوئی۔ لیکن وہ یہ سوچنے پر مجبور رہی کہ اس لڑکی نے ضرور کوئی ایسی ٹھوکر کھائی ہے جس کی وجہ سے یہ لڑکی ساری دنیا سے بددل ہوئی ہے۔ ہیلن نے اپنے من کے ساتھ فیصلہ کیا کہ وہ اس راز کو حل کر کے ہی رہے گی۔ وہ ریٹیا کی حقیقت جاننے کے لئے بیتاب تھی۔ اس لئے وہ دوسری صبح بھی ریٹیا کے فلیٹ میں گئی۔ لیکن اُس نے سارے فلیٹ میں خاموشی کا راج پایا۔ وہ حیران ہوئی اور سوچنے لگی کہ آخر یہاں کیا ہوا ہے۔ یہ زندگی خاموش کیوں ہے۔ وہ "ریٹیا" پکارتی ہوئی فلیٹ میں داخل ہوئی۔ فلیٹ کی خاموش زندگی میں ایک نحیف آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔ یہ ریٹیا کی آواز تھی

ہیلن اس آواز کی طرف دوڑ گئی وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ یہاں پر اس نے رٹیا کو علیل پایا۔ اس نے ہیلن سے نحیف آواز میں کہا۔

"میرا بچہ مر جائے گا. . . . . . . ہاں اُس کو مر جانا ہی چاہیئے۔"

ہیلن نے کچھ اور نہ سُنا۔ وہ دوڑتی ہوئی بچہ کے پاس گئی۔ اُس نے بچے کو اپنے باہوں میں لیا۔ وہ ایک بچہ تھا۔ لیکن اس کا رنگ ہیلن اور رٹیا سے نہیں ملتا تھا۔ وہ کالے رنگ کا بچہ تھا۔ لیکن ہیلن اُس کا رنگ نہیں دیکھ رہی تھی۔ بلکہ وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ یہ ایک بچہ ہے۔ ہیلن نے رٹیا سے کہا

"میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔"

"نہیں ـــــ نہیں" رٹیا چیخ پڑی۔ "یہاں کے لوگ یہ جان پائیں گے کہ میرا بچہ اُن کے رنگ سے جُدا ہے۔ وہ مجھے یہاں سے نکال دینگے۔ میں اس لئے آج تک اپنے بچے کو چھپاتی رہی۔ لیکن ہر بار کسی نہ کسی طریقے کوئی نہ کوئی دیکھ لیتا ہے۔ اور پھر مجھے وہ لوگ یہاں سے نکال دینگے۔ میں سر ڈھانپنے کے لئے سفید فاموں کے پاس آئی ہوں۔ تو وہ میرے بچے کو دیکھ کر مجھے اپنی کالونی سے نکال دیتے ہیں۔

جاتی ہوں نیگرو کی بستی میں وہ مجھے دیکھ کے سفید کتیا کہتے ہیں۔ اور مجھے اپنی کالونی میں رہنے کے لئے جگہ نہیں دیتے ہیں۔ بڑی مشکل کے بعد یہ فلیٹ میرے ہاتھ میں آیا ہے اور اب یہ فلیٹ بھی میرے ہاتھ سے جائے گا۔ اب — میں — میں کہاں جاؤں۔"

"نہیں" ہیلن نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔ "اب تمہیں یہاں سے کوئی نہیں نکال دے گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر آ گیا۔ اُس نے مریض کا معاینہ کر کے دوائی لکھ دی۔

رٹیا نے ہیلن سے کہا۔

"جب مائیک کے ساتھ میری شادی ہوئی۔ میں بہت خوش ہوئی۔ میں اُس کے رنگ کے ساتھ محبت نہیں کرتی تھی۔ میں مائیک کو چاہتی تھی لیکن مائیک مجھے چھوڑ کے گیا۔ موت نے مائیک کو مجھ سے ہمیشہ کے لئے جُدا کیا اور مجھے اس وحشی سماج میں اکیلا چھوڑ دیا۔"

وہ تھک گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کیں۔ ہیلن نے رٹیا کا جسم کمبل سے ڈھانپ لیا۔ اور پھر اپنے مکان میں واپس آئی۔

اُس نے اپنے خاوند کو سخت غصّے میں پایا۔ ہیلن کو دیکھ کر

فرینک نے کہا۔

"وہ کُتیا ابھی بھی ہمارے فلیٹ میں ہے۔"

"فرینک! یہ تم بول رہے ہو۔" ہیلن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "میں یقین نہیں کر سکتی ہوں کہ یہ میرا فرینک بول رہا ہے۔ میں یقین نہیں کر سکتی ہوں کہ میرے فرینک کے سینے میں ایک وحشی کا دل دھڑکتا ہے جہاں بنی نوع انسان کے لئے انصاف، محبت اور ممتا نہیں ہے۔"

"میں پہلے خویش اور پھر درویش کے قول پر عمل کرتا ہوں میں سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں رکھ سکتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ لوگ ہمیں انگشت نما کریں یا ہمیں کوئی ضرر پہنچا دیں۔ ہمیں اس کُتیا کو یہاں نکال دینا چاہئے۔"

"وہ کُتیا نہیں انسان ہے۔" ہیلن غصّے سے آگ بگولا ہوئی۔ "اگر تم نے اس حالت میں فلیٹ سے ریٹا کو نکال دیا تو پھر میں بھی زندگی بھر تم سے دُور ہو جاؤں گی۔"

"اُف ۔۔۔ کس عورت سے پالا پڑا ہے۔" فرینک نے دانت پیستے ہوئے کہا

"میں اُس عورت کے لئے لوگوں سے دشمنی مول لینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں نے اپنا دن رات ایک کر کے اس عمارت کو کھڑا کیا۔ میں اس عمارت کا اس طرح جنازہ نکلتے ہوئے نہیں

دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے تم اپنے اس اونچے مکان کے لئے اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہو۔ تم کو تمہارا مکان مبارک ہو۔ میں جا رہی ہوں۔"

لیکن اسی لمحے اُن کا دروازہ رنڈیا نے کھول دیا۔ یہ رنڈیا کی نحیف آواز تھی جو کہہ رہی تھی۔

"بہن تم دونوں میاں بیوی میرے لئے کیوں لڑ رہے ہو۔ میں جا رہی ہوں۔"

اُس کے ہاتھوں میں وہ بچہ تھا جو ساری کالونی کے لیے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ کیا ایک معصوم بے ضرر انسان بھی انسان کے لئے مسئلہ بن جاتا ہے۔ ہیلن نے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا ہے رنڈیا۔ یہ تو اصول کی بات ہے اور جہاں انسان کا ضمیر یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ سب اُس کے اپنے اصول کے خلاف ہے۔ وہاں اُس انسان کا رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے میں تمہارے ساتھ . . . ."

اچانک انہوں نے شور سنا۔ سب چیخ رہے تھے۔

"آگ ــــ آگ"

فرینک بھاگتا ہوا باہر چلا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ چند غنڈوں نے اُس کے نئے مکان کو آگ لگا دی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس کی برسوں کی محنت کو ان وحشی لوگوں نے خاک میں ملا دیا۔

مگر اس جلتے ہوئے مکان سے ایک ایسی کرن نکل آئی جس نے فرینک کو انسانیت سے آشنا کیا۔ جس مکان کو بچانے کے لئے اُس نے ایک مکان کو ٹھوکر لگا دی۔ وہی مکان جل گیا۔ ہیلن اور ریٹا فرینک کے ارمانوں کا خون ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ لیکن جو فرینک اُن کی طرف آرہا تھا۔ اُس کے ارمانوں کا خون نہیں ہُوا تھا۔ اُس نے ریٹا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چلو بہن! اب میں اتنا کمزور نہیں ہوں جو کسی کا مقابلہ نہ کر سکوں۔"

فرینک کو محسوس ہُوا کہ نفرت کا وہ گھر جل گیا۔ جو اُس کے اور ریٹا کے درمیان ایک دیوار بن کے کھڑا ہُوا تھا۔



سودا

کل شوکت بہت خوش تھا۔ کیونکہ کل اُس نے سب کچھ جذبات کی عینک سے دیکھا تھا۔ لیکن آج جذبات ٹھنڈے تھے۔ سوچ بچار کے ترازو میں ہر بات کو تول کر وہ اسی فیصلے پر پہونچا۔ کہ کل کا فیصلہ اس نے جذبات میں آکر کیا تھا۔ اور آج اس کے سامنے زندگی کی عارضی چمک دمک پھیکی پڑ گئی تھی۔

میجر درانی نے شوکت کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ پھر اپنے شراب سے بھرپور پیگ کو ہونٹوں سے لگایا۔ اور ایک لمبی چسکی لی۔ اُس نے شوکت سے کہا۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟"

"کس بارے میں"؟

"زندگی کے بارے میں"

"زندگی" شوکت نے گہرا سانس لیا۔ آگے کہا۔

"آپ اپنی بتایئے۔"

"شوکت" درانی نے چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "تم لندن جاؤ وہاں کے نائٹ کلب میں جاؤ جو وہاں قدم قدم پر ملتے ہیں۔ ایسے کلب میں کسی انگریزی لڑکی کو اپنے گورے جسم سے اسکرٹ اور یہاں تک (Bra) گرانے تک، دیکھو۔ پھر اُس کے جسم کا ہر عضو ننگا ہو کر خوب خوب تکتے رہو۔ وہی زندگی ہے۔ عریاں۔ بے ترتیب اور بے ہودہ۔"

درانی نے ۵۵۵ ٹِن سے سگریٹ لگاتے ہوئے شوکت سے کہا۔

"خیال اپنا اپنا۔ تمہارا یہ خیال ہے۔ کہ زندگی عریاں بے ترتیب اور بے ہودہ ہے۔ یہ بات خارج نہیں کی جا سکتی لیکن زندگی بذاتِ خود کیا ہے۔ زندگی وہی ہے، جو آپ ہے، جو آپ کے خیالات ہیں جو آپ کے سوچنے کا ڈھنگ ہے۔ میرے خیال میں زندگی ایک گلستان ہے۔ لیکن اس گلستان میں جہاں کانٹے ہیں، وہاں گل بھی ہیں۔ اور جہاں پھول ہیں وہاں خار بھی"

ماحول میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دن کے اس وقت ہوٹل سنسان پڑا تھا۔ شوکت نے اعلیٰ سگریٹ کا دھواں خوشبو سے لبریز ہو۔ تو آدمی دھوئیں میں بھی قید ہونا چاہتا ہے۔ اگر زندگی اب اردگرد پھیلا دیا۔ میجر درانی نے اپنے پیگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اگر دھواں

میں دوسرے آرام و آسائش کے سامنے بیسترہوں۔ تو آدمی کسی چیز کو کھونے کے لئے تیار بھی ہوتا ہے۔"؟

"خوشبودار دھوئیں کے لئے آدمی اپنی زندگی کو قید نہیں کر سکتا۔ آزاد فضائیں بسنے والے کو کانٹے بھی پھول لگتے ہیں زندگی کے اُس آرام و آسائش کو کیا کرنا جس میں دل کا خون کرنا پڑے"

درانی نے گہرا سانس لیا۔ شراب کا گھونٹ پی کر اس نے نرم اور دھیمی آواز میں کہا۔

"سودا کی باتوں میں دل کا ذکر لانا اچھا نہیں ہے۔ پھر تم تو جانتے ہو شراب کے ہلکے خمار میں زندگی کے اور نقشے پھیکے پڑتے ہیں۔"

"میجر" شوکت نے تیز آواز میں کہا۔ "یہ جنگ کا میدان نہیں ہے۔ یہاں گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے ـــــ خون ہوتا۔ پھر ہار اور جیت ہوتی ہے۔ اور پھر سودا کی باتیں ہوتی ہیں۔"

"یہ تم اچھی طرح جانتے ہو مسٹر شوکت کہ تم زندگی کے ہر مورچے پر ہار گئے۔" میجر درانی نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"اب تو تمہاری شکست یقینی ہے۔ لیکن تمہارا حریف ہار کو شکست کا نام نہیں دینا چاہتا ہے۔ وہ تمھاری ہار کو ہار کے نام سے پکارنا بھی گوارہ نہیں کرتا ہے۔ وہ تو سودا چاہتا ہے ـــــ سودا ـــــ ایک ایسا سودا جس میں تمہارا رنگین مستقبل کا خواب

بند ہے۔"
شوکت نے غور سے درانی کو دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر کہا۔
"رقم بھاری ہے۔ دل نازک ہے۔ بھاری رقم کی چوٹ کیسے سہہ لے گا۔ بے حس ہو جائے گا۔ دم توڑ لے گا۔ مانا کہ میں غریب ہوں۔ سماج کے ایک ایسے حلقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ جہاں تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا۔ رہنے کے لئے ایک گھر اور کھانے کے لئے دو وقت کی روٹی بھی ایک خواب بنکے رہ جاتی ہے۔ لیکن اس طبقے کے لوگ دلوں کا سودا نہیں کرتے بھاری رقم کے لالچ میں اپنے دل کو پاش پاش نہیں کرتے۔ نہیں میجر ایسا سودا منظور نہیں۔ میں چاندی اور سونے کے بوجھ تلے اپنے دل کو نہیں روندھ سکتا ہوں۔"
"جذباتی مت بنو مسٹر شوکت" درانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"زندگی کے فیصلے جوش میں آکر نہیں کئے جاتے۔ پھر وعدے سے انحراف ہونا اچھی بات نہیں۔ تم بھولتے کیوں ہو کہ کل جب تمہارے شاندار مستقبل کا اعلان ہوگا۔ تو تمہیں ایک لاکھ روپے نقد ملیں گے۔ ایک لمحہ میں تمہاری زندگی کا نقشہ تبدیل ہوگا۔"
"تبدیل ضرور ہوگا میری زندگی کا نقشہ"۔ شوکت نے

دھیمی آواز میں کہا۔لیکن میری زندگی پامال بھی ہوگی۔چاہت کے سبھی راستے بند ہونگے۔"

"تم چاہت کو خرید لو۔حسن کو خرید لو۔زندگی کے عیش آرام خرید لو۔یہ سب تمہیں مل سکتا ہے۔جب تمہارے پاس ایک لاکھ روپیہ ہوگا۔" درانی نے شوکت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے کہا۔

"اچھا ہے۔کہ تم میرے کہنے پر عمل کرو۔"

"رات بھر سوچا۔سوچ کر میں اس نتیجہ پہ پہنچا کہ چاندی کے چند ٹکڑوں کے واسطے میں اپنی زندگی قید نہیں کرلونگا۔میں نے کل جو وعدہ کیا تھا۔وہ میں نے جذبات میں آکر کیا۔زندگی کے شوخ رنگوں کی لالچ میں کیا۔اور جب میں نے ٹھنڈے دل سے غور کیا۔تو اس نتیجے پر پہونچا۔کہ وہ سب ایک لمحاتی خوشی ہے۔اور لمحاتی خوشی کے لئے میں زندگی بھر کا سکون کھونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔میں جانتا ہوں کہ میں ایک معمولی سپاہی ہوں۔جس کے پاس کل ایک لاکھ روپے ہونگے۔یہ سودا بہت مہنگا ہے۔لیکن جناب مجھے یہ سودا منظور نہیں ہے۔"

"پھر غور کرو۔"میجر درانی نے گھمبیر آواز میں کہا۔شاید تم اپنے فیصلے کو بدل لوگے۔"

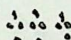
"نہیں جناب میں نہیں بدل سکتا ہوں۔اپنے فیصلے کو

شوکت نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میں ایک لاکھ روپے اور لفٹنٹ بننے کے عوض میں آپ کی اپاہج اور اندھی بہن کو اپنی زندگی کا شریکِ حیات نہیں بنا سکتا ہوں۔" یہ کہکے شوکت چلا گیا۔ دُرانی نے اپنے بیگ کو غور سے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"ہر بار۔ ہر ایک آدمی آخر میں یہی کہکے چلا جاتا ہے۔ کہ یہ سودا اُس کو منظور نہیں ہے۔"

ماحول پر سناٹا چھا گیا تھا۔



جب بمبئی جھک جائے گی

جب میں تاج محل ہوٹل کی اونچی مینار جیسی عمارت کو دیکھتا تھا تو نہ جانے میرے دماغ میں یہ سوال کیوں اٹک جاتا تھا۔ کہ جب بمبئی جھک جائے گی تو تاج محل ہوٹل کی شاندار عمارت کہاں ہوگی شاید تاج محل ہوٹل کی یہ عمارت الٹی ہوکر سمندر میں نظر میں نظر آئے گی۔ یا گیٹ وے آف انڈیا سے ٹکرا کر راک این رول" کا منظر پیش کرے گی۔ تب اس عمارت میں رہنے والے یہ امیر لوگ کہاں ہوں گے۔ شاید فٹ پاتھ پر نظر آئیں گے یا جانوں کو بچاتے ہوئے کسی گلی کوچے میں بھاگتے نظر آئیں گے۔ نہیں صاحب۔ یہ لوگ اتنے کمزور دل والے نہیں ہیں کہ بمبئی میں رہنے والے فلمی ستاروں کی طرح ہر سڑک پر اپنے دامن کو پھیلاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ لوگ تو کسی زمین دوز کمرے میں اطمینان سے

بیٹھکر بمبئی کو جھکنے سے روکنے کے لئے منصوبہ مرتب کرینگے۔ کیوں کہ یہ لوگ کبھی بمبئی کا جھکنا پسند نہیں کرینگے۔ بمبئی کی دھرتی میں ان لوگوں کے ایسے راز بھی پوشیدہ ہیں جن کے افشا ہوتے ہی ان لوگوں کو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا ہوگا۔ لیکن یہ سب تب ہی ہوگا جب بمبئی جھک جائے گی۔ لیکن ابھی تو بمبئی نہیں جھکے گی۔ پھر میں ابھی سے کیوں سوچنے لگا۔ میں نے اس خیال سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے تاج محل ہوٹل کے پٹھان چوکیدار سے کہا۔

"پٹھان بھائی میں نے اس ہوٹل کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں یہ ہوٹل اندر سے دیکھ لوں۔"

"اے بچے تم ہم کو ہماری نوکری سے نکال دینا چاہتا ہے تم نہیں جانتے ہو کہ یہ بڑے لوگوں کا ہوٹل ہے۔ یہاں بڑے لوگ رہتے ہیں۔ یہاں چھوٹے لوگوں کا کچھ کام نہیں ہے۔"

پٹھان میرے ساتھ الجھنا چاہتا تھا۔ لیکن جب ایک حسین لڑکی کی آواز آئی تو پٹھان خود الجھن میں پڑ گیا۔ حسین لڑکی کی گلاب کی پتیاں جیسے ہونٹوں کے درمیان سے نہایت غصیلی آواز نکل آئی۔

"چوکیدار۔ تم اس فضول آدمی کے ساتھ کیا باتیں کر رہا

تھا؟ تم نے یہ نہ دیکھا کہ ہم آ رہے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ عین لڑکی کو جو کی دار کچھ سمجھاتا۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح چلی گئی۔ اس کے لباس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑے آدمی کی بیٹی تھی۔ میں نے پٹھان سے کہا۔

"تم نے ہمارا سارا معاملہ چوپٹ کیا۔"

"بھائی پٹھان اس لڑکی نے ایسا کیا کہا کہ تم لال پیلے ہو رہے ہو۔"

"تم ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ لڑکی سچ کہہ رہی تھی۔ کہ تم اچھے آدمی نہیں ہو۔"

اچھے بُرے . . . . ایک لمبی داستان ہے۔ کون کیا ہے؟ کون جانتا ہے؟

بمبئی کی ان رنگین سڑکوں پر بدمست جوانیوں کا لڑکھڑانا دلفریب ضرور تھا۔ لیکن ان کی ننگی کالی کالی ٹانگیں مغربیت کا مذاق اڑا رہی تھیں، لیکن میری نظر ان بدمست جوانیوں کے بدلے زندگی سے مایوس ہوئے اور غربت میں چھپے ہوئے آدمی کے سوچتے ہوئے چہرے پر گر پڑی۔ میرے ڈرائیو کی صاف و شفاف سڑک پر مجھے کھولی میں پڑے ہوئے انسانوں کی زندگی یاد آئی۔ تب مجھے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ میرے

ڈرائیو کی لمبی لمبی اور اونچی اونچی عمارتیں سمندر میں تیرتی ہوئی نظر آئیں ــــــ کوئی کہہ رہا تھا۔

"روک لو میرے اس محل کو۔ میں نے اس محل کو تعمیر کرنے کے لیے بمبئی کی پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چکلہ چلایا۔ خفیہ طور پر شراب فروخت کی اور نہ جانے کیا کیا اشیاء اسمگل کی۔ میری برسوں کی محنت کو برباد ہونے سے بچالو۔"

لیکن افسوس تو مجھے اس بات پر ہو رہا تھا کہ کھولیوں میں رہنے والے لوگوں نے شور وغل نہیں مچایا۔ وہ اطمینان سے بیٹھے ہوئے کھولیوں کو جھکتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس صرف ایک ہی سوال تھا کہ کل بھی ان کے پاس روٹی نہ تھی اور آج بھی نہیں ہے۔ شاندار عمارتیں گرتی ہیں تو گرنے دو۔ ان کا کیا جاتا ہے۔ نہ جانے میں کیا کیا سوچتا تھا اور نہ جانے میرے خیالات کی وسعت مجھ کو کہاں لے جاتی ایک سریلی آواز نے میرے خیالات منتشر کردئے۔

"اندھے ہو گیا؟"

یہ تاج محل ہوٹل والی لڑکی تھی۔ جس کے نرم و نازک ہاتھ پر میرا وزنی پیر پڑ گیا۔ مجھے خود بھی اپنے پیر پر غصہ آیا۔ اور اس کے نرم و نازک ہاتھ کو ہمدردانہ نظروں سے تکنے لگا۔

اس لڑکی نے پھر کہا۔

"اندھا"

"اندھا" میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔

"اندھا دنیا میں کون نہیں ہے۔ کوئی دولت جمع کرنے کے لئے اندھا بنتا ہے۔ کوئی شہرت حاصل کرنے کے لئے اندھا بنتا ہے۔ کوئی بھیک حاصل کرنے کے لئے مصنوعی اندھا بن جاتا ہے۔"

"مسٹر بیکار" اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تم نے اپنے جیسے بھکاری ہوتے سے میرے ہاتھ کو زخمی کیا۔ میں تم جیسے آدمی کے منہ نہیں لگنا چاہتی ہوں۔"

لڑکی یہ کہکر چل دی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بمبئی کے FISHING HOME میں جسطرح مچھلیوں کو شیشے کے پنجروں میں بند کر رکھا ہے۔ اسی طرح سنگینوں کے پنجرے میں غریبوں کو بند رکھا جاتا ہے۔ جہاں افلاس سے دبی ہوئی آوازیں دم توڑتی ہیں۔ لیکن جب اس FISHING HOME کے آگے سیٹھ کی ایک گاڑی نے جانے سے انکار کیا۔ تب اُس کی گاڑی کو پیٹرول پمپ تک لینے کے لئے دو ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ میں آگے بڑھا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی پیٹرول پمپ پر پہنچ گئی۔ میرا

سارا بدن پسینے سے شرابور ہوا۔ لیکن میں خوش ہوا۔ خوش اس لیے کہ دو ہاتھ بھی کسی کے کام آسکے۔ میں نے سیٹھ سے کہا۔

"سیٹھ صاحب آپ گاڑی میں پیٹرول کم کیوں ڈالتے ہیں؟"

"بھئی تم ان ڈرائیوروں کی نسل سے واقف نہیں ہو۔ یہ گاڑی کی ٹنکی سے پیٹرول نکال کر مالک سے چوری کرتے ہیں۔"

میں سیٹھ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ دُنیا میں کون چور نہیں ہے۔ کوئی بڑا چور ہے اور کوئی چھوٹا چور ہے۔ کوئی سرکار سے چوری کرتا ہے۔ کوئی اپنے مالک سے چوری کرتا ہے۔ اور کوئی خدا سے چوری کرتا ہے۔ لیکن نہ جانے میں کیوں اُسے یہ سوال پوچھ نہ سکا۔ سیٹھ نے پیٹرول ڈال کر مجھ سے کہا۔

"لو۔"

یہ ایک روپیہ کا نوٹ تھا۔ میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ میں نے یہ کام اس لئے نہیں کیا تھا کہ آپ مجھے اس کا معاوضہ دیں گے۔" میں نے تو یہ کام انسانی فرض جان کر کیا۔"

سیٹھ نے جیب میں نوٹ رکھا اور مجھے ایک کارڈ دیتے ہوئے

کہا۔

اس پر میرے دفتر کا پتہ ہے۔ اگر کام چاہتے ہو۔ تو مجھے اس پتہ پر ملو۔"

اس کے ساتھ ہی سیٹھ کی گاڑی چل دی۔ اندھے کو کیا چاہئے؟ دو آنکھیں۔ میں یہ موقعہ کھونے کے لئے تیار نہیں تھا میں دوڑتے ہوئے سیٹھ کے پاس پہنچ گیا۔

سیٹھ نے کہا۔

"کہاں تک پڑھا ہے۔"

"جی میں بی۔ اے پاس ہوں۔"

"اور اب تک کام نہ ملا۔" سیٹھ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ "اس دیس میں اگر ہم سیٹھ لوگ نہ ہوتے نہ جانے تم غریبوں کا کیا حال ہوتا۔"

مطلب کے لئے آدمی الّو بن جاتا ہے۔ اس لئے میں نے الّو کی طرح لمبی گردن کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں اس میں کیا شک ہے؟"

"اچھا دیکھو ــــ فی الحال تمہیں ڈیڑھ سو روپے کی تنخواہ ملے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس سے پہلے کہ سیٹھ کچھ آگے کہتا۔ میں نے کہا

"جی جناب ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔"

"اچھا"

اُس نے چپراسی کو بلایا اور اس سے کہا۔

"جاؤ اس کو دینا ناتھ کے پاس لے جاؤ۔ وہ اس کو کام سمجھائے گا۔"

اس لمبی اور اونچی بلڈنگ میں مجھے ایک ماہ کام کرتے گزرا اس آفس میں میرا کام تھا۔ ادھر کی رقم ادھر اور اُدھر کی رقم ادھر کر دینا۔ پھر ایک دن وہ لڑکی بھی نظر آئی جو میری رگ رگ میں سما گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"آداب جناب۔"

میں نے آج فلسفیانہ روِش چھوڑ دی۔ اسی لئے رومانی انداز میں، میں نے اس لڑکی کا استقبال کیا۔ لیکن وہ لڑکی غصے سے چیخ پڑی

"یو۔ ایڈیٹ تمہیں بات کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔"

میں کچھ نہ سمجھا۔ صرف بغلیں جھانکتا رہا۔ سمجھا تھا وہ جس نے مجھے کبھی بے کار اور بھوکے پیٹ ہونے کا طعنہ دیا تھا — میں آج اُس کو کہہ دوں۔

"دیکھو آج میں بے کار نہیں ہوں۔ بھوکے پیٹ نہیں ہوں اس لئے رومانی انداز اختیار کیا۔"

چپراسی دوڑتے ہوئے میرے پاس آیا۔ اُس نے کہا۔

"صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ بہت غصے ہو رہے ہیں۔"

میں سیٹھ کے کمرے میں داخل ہُوا۔ لڑکی کو اُس کے کمرے میں پایا۔

"مسٹر کلرک" سیٹھ غصے سے چیخ پڑا۔ "تم نے میری بیٹی کے ساتھ نا روا سلوک کیوں کیا؟"

میں نے کہا۔

"جناب مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ آپ کی بیٹی ہیں۔"

"شٹ اپ" آئندہ کبھی ایسی غلطی کی تو تمہیں نوکری سے نکال دیا جائے گا۔"

"جی۔"

میں سیٹھ کے کمرے سے باہر آیا۔

"تو یہ لڑکی سیٹھ کی بیٹی ہے؟" میں بڑبڑایا۔ پھر خواہ مخواہ کی سوچ میں ڈوب گیا۔ ایک بات میں نے طے کی تھی کہ میں سیٹھ کی لڑکی کے بارے میں نہیں سوچ لونگا۔ لیکن میرے دل کی یہ کیفیت بمبئی کی رنگین اور حسین قہقہوں میں ڈوب گئی۔ دینا ناتھ نے ایک دن مجھے کہا۔

"جانتے ہو تم سیٹھ کی بیٹی کی شادی سوموار کے دن ہو رہی ہے۔"

میں احتجاج کرنا چاہتا تھا۔ لیکن احتجاج کا سوال وہاں

ہی پیدا ہوتا ہے جہاں کوئی حق ہو۔ یہاں تو صرف یک طرفہ محبت تھی۔ پھر حق کیسا؟ سیٹھ نے مجھے بلایا۔

"آج تم کو میرے ساتھ میرے گھر آنا ہوگا۔ سوموار کو نرملا کی شادی ہو رہی ہے۔ مجھے مہمانوں کی فہرست بنانا ہے۔ اس لئے آج تم کو میرے ساتھ آنا پڑے گا۔"

"جی بہت اچھا"

میں تو یہ کام خود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں کسی پر اپنے دل کا حال ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اس دن پہلی بار سیٹھ کی شاندار کار میں سوار ہوا۔ میں نے سیٹھ کی اونچی بلڈنگ پر نظر دوڑائی۔ دل سیٹھ سے یہ سوال پوچھنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔

"اے سیٹھ تم اتنی دولت کیوں جمع کر رہے ہو۔ ایک ہی تو ہے تمہاری بیٹی۔"

لیکن پیسے کو کس نے چھوڑا جو سیٹھ چھوڑتا۔ کہتے ہیں جب نرملا کی ماں کی موت ہوئی تو سیٹھ نے اعلان کیا تھا کہ اب وہ سنیاس لے گا۔ لیکن چند دنوں کے بعد ہی وہ پھر دولت بڑھانے کی دوڑ میں شامل ہو گیا۔ گاڑی سیٹھ کی پندرہ طبقے والی عمارت کے سامنے رک گئی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ سیٹھ کی عمارت جھک رہی ہے اور پھر ساری بمبئی

جھکنے لگی۔ سیٹھ چیخ پڑا۔

"بھونچال ـــ میری بیٹی نرملا ـــ"

اچانک میں نے کہا۔

"آپ کی بیٹی کس طبقے میں ہیں؟"

"پانچویں طبقے میں!"

میں پاگل کی طرح بھونچال سے ہلتے ہوئے اس مکان میں داخل ہُوا۔ نہ جانے میں کب اور کس طرح پانچویں منزل پر پہنچ گیا۔ میں نرملا چیختے ہوئے فلیٹ میں داخل ہُوا۔ نرملا پلنگ پر مایوس اور پریشان پڑی ہوئی تھی۔

"نرملا دیوی نیچے آئیے۔ بھونچال...."

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن میری ٹانگوں میں اتنی قوت نہیں ہے کہ نیچے آسکوں۔"

لیکن یہ مکان گر جائے گا اور میری نرملا مر جائے گی نہیں ـــ نہیں یہ نہیں ہوگا۔ میں نے اُسکو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور اس نے اپنی باہوں کو میری گردن میں حمایل کر دیا۔ اور اب میں نیچے آرہا تھا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ میں دُنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی ہوں۔ جس کو میں نے چاہا وہ حُسن کی دولت میری گود میں سمٹ کر آئی۔ میں جب نیچے پہنچا تو میں نے ہلتے ہوئے مکانوں کو دیکھا۔ مجھے جھکتی ہوئی بمبئی بہت اچھی لگ رہی تھی جھکتی ہوئی بمبئی

میں سیٹھ نے یہ نہ کہا کہ تم نے میری بیٹی کے ساتھ بدتمیزی کیوں
کی۔ لیکن بمبئی جُھک نہیں سکی۔ بھونچال کا اثر زائل ہوتے ہی
سیٹھ مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگا۔ نرملا اب میری بازوؤں
میں نہ تھی۔ سیٹھ نے کہا۔

''یو ایڈیٹ تم نے پھر میری بیٹی کے ساتھ بدتمیزی کی۔ تم
کو نوکری سے نکال دیتا ہوں۔''

میں سیٹھ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف آسمان کی طرف دیکھا
اور آسمان والے سے کہا کہ بمبئی کب جھک جائے گی۔

تلخ یادیں

"حسب معمول کارخانے جانے سے پہلے پرکاش ساحل کی سیر کرنے کے لئے نکلا۔ چھوٹے بچے سمندر کے خوبصورت ساحل پر آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے نہ جانے کیوں اُس کو چھوٹے بچوں کے اس کھیل پر ہنسی آئی۔ شاید اس لئے کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ زندگی بھی خود ایک آنکھ مچولی کا کھیل ہے۔ ہردم انسانی وجود تلخیوں کے جال میں بند رہتا ہے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں کھو کر نہ جانے کہاں پہنچ جاتا ہے اور وہ سب کو بھول جاتا ہے۔ جو اُس کو یاد رکھنا چاہئے۔ اچانک، اُس کو یاد آیا کہ بھانومتی ہر صبح ساحل پر ملتی تھی۔ وہ بھانومتی کو دیکھ کر کہتا۔

"بھانومتی اچھی ہو۔"

وہ جواب دیتی

"ہاں، اچھی ہوں آپ کیسے ہیں ؟۔"

"میں بھی اچھا ہوں۔"

اس چھوٹی سی ملاقات کے بعد دونوں اپنی اپنی راہ لیتے تھے۔ کوئی غلط بات سوچنے کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ وہ چالیس سال کے قریب ہونے کو آیا تھا۔ اور بھانومتی تیس سال کی تھی۔ یوں تو اس کی زندگی کا سورج وہاں تھا۔ جہاں پل دو پل میں غروب ہو جاتا ہے۔ پھر اُسے یاد آیا۔

"بھانومتی کیوں نہ آئی ؟۔"

اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہُوا کہ شاید بھانومتی نے یہ راستہ ہی ترک کر دیا۔ پھر وہ خود سے بڑبڑانے لگا۔

"اور کرتی بھی کیا۔ کب تک انتظار کرتی"۔

اس کی نظر ایک نوجوان غریب جوڑے پر پڑی جو ایک دوسرے کو چلنے کھلا رہے تھے۔ تب اس کو وہ زندگی یاد آئی جب وہ موٹر کے ایک بڑے کارخانے کا مالک تھا۔ جب وہ ایک معمولی آدمی تھا۔ غربت سے تنگ آکر اپنے گاؤں کو چھوڑ کر اس چھوٹے شہر میں آگیا۔ یہاں ہی اُس نے موٹروں کی مرمت کا کام سیکھا۔ اُنہی دنوں اُس کی شادی گاؤں کی

ایک لڑکی رتنا سے ہوئی۔ گاؤں کی اس الھڑ دوشیزہ کو پاکر وہ پھولا نہ سمایا۔ اُس کی رگوں میں خوشی سے خون تیزی سے جوش مارنے لگا۔ رتنا کی سیاہ اور لانبی زلفوں کے سائے میں نہ جانے اُس نے کتنے بڑے بڑے کارخانے تعمیر کئے۔ اسی جوش نے اس کو اپنی ذاتی موٹر مرمت کی دوکان کھولنے پر مجبور کیا۔ اپنا کاروبار جمانے کے لئے اُس نے شہر کی مشہور دوکان کرن سنز کے بہترین مکینک رام لعل کو اچھی تنخواہ دے کر اپنی دوکان پر لایا۔ تب سے اس کی تجارت چمک اُٹھی۔

کرن سنز کا بوڑھا مالک موہن چندر یہ حال دیکھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ آخر یہ بوڑھا ایک دن پرکاش کے پاس آیا اور غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

"کتے کی اولاد تم نے میرا سب سے اچھا کاریگر چھین لیا۔"

پرکاش سب کچھ برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن اُس کا خون یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اِس کے باپ کو کتا کہے۔ اس لئے وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس بوڑھے کو دو چار گھونسے رسید کئے۔ بوڑھا بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ بوڑھے نے جاتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھ اس کا بدلہ میرا بیٹا تجھ سے لے گا۔"
پرکاش ہنسنے لگا کیوں کہ بوڑھا مار کھانے کے بعد بھی ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ بات تو ایسی ہو لی تھی کہ رسّی جل گئی پر بل نہ گیا۔ پرکاش اچھی طرح جانتا تھا کہ بوڑھے کا بیٹا تنومند اور طاقتور ہے۔ کیوں کہ وہ فوج میں رہا تھا۔ یہاں ہی اس کے جوان بیٹے نے جنگ کے زمانے میں کثیر التعداد دولت کمائی۔ لیکن اُس کا باپ، میکنک کی دوکان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اس ضد کی وجہ سے باپ اور بیٹے میں اَن بن رہتی اور وہ ایک دوسرے سے الگ رہتے تھے۔

ایک دن بوڑھے کا بیٹا سندر اپنی نئی کار لے کر اُس کے سامنے کھڑا ہُوا۔

پرکاش نے کہا۔

"کہئے جناب میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

"بھئی اس کے ٹائیر میں کچھ ہوا ہے۔"

پرکاش نے موٹر کے ٹائیر کی مرمت کی۔ مرمت کر کے اُس نے بولا۔

"جناب مرمت ہُوا۔ چار روپے مرمت کے بنتے ہیں۔"

"چار روپے!" سندر لال حیران ہو کر بولا۔ "صِرف چار روپے لیکن میرے خیال سے تمہارے آٹھ روپے بن جاتے ہیں۔"

"جناب اپنا ریٹ یہی ہے۔ میں اصول کا پابند ہوں میں زیادہ نہیں لے سکتا ہوں۔"

اب سندر لعل نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دلچسپ آدمی ہو۔"

"اس لئے نا کہ آپ کے والد سے پہلے ہی ملاقات ہوئی ہے۔"

"چھوڑ دو اُس بات کو۔ میں اپنے والد کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن تم ہو بہادر آدمی۔ اچھا آؤ میرے ساتھ سامنے والے ہوٹل میں چلئے پی لیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ سارے شہر میں ان کی دوستی کو دیکھ کر لوگ رشک کرنے لگے۔ ایک دن پرکاش نے اپنے دوست سندر لعل سے کہا۔

"آج میرا جنم ہے۔ یعنی میرا مطلب جنم دن ہے۔ آج آپ ہمارے گھر آیئے اور اپنی بیوی کو بھی ساتھ لائیے۔ میں انتظار کروں گا۔

سندر لال اپنی بیوی کو لے کر پرکاش کے جنم دن پر اس کے گھر آیا۔ پرکاش نے اس کو دیکھ کر کہا۔

"میرے دوست! یہ میری بیوی رتنا ہے۔"

سندر نے اُس سے اپنی بیوی سے ملایا۔

"یہ میری بیوی بھانومتی ہے۔"

لوگوں نے اُن کی دوستی کے ساتھ ایسے قصے بھی وابستہ کئے جن کو سُنکر پرکاش کو اُن کی گندی ذہنیت پر رونا آتا تھا۔ ایک دن ایک آدمی نے اُس سے کہا۔

"کیوں صاحب آپ کی بھانومتی کہاں ہے ؟"

وہ غصّے کی شدّت سے جل اُٹھا اور پھر اُس نے اُس آدمی کو مارتے مارتے زخمی کر دیا۔

وہ لوگوں کی اس گندی ذہنیت کو کوس رہا تھا۔ جو دوستی کے پاک رشتے پر انگشت نمائی کر رہے تھے۔ لیکن اُس کو کیا معلوم جس کو وہ دوست سمجھ رہا تھا۔ وہ اُس کا سب سے بڑا دُشمن ثابت ہوگا۔ وہ اُس کی بیوی کو بھگا کر لے گا۔

گاؤں کی اس الھڑ لڑکی کو اُس نے اونچے خواب دکھلائے دوستی کے پاک رشتے کو سندر نے بُری طرح زخمی کیا تھا۔ اُس نے پرکاش کی زندگی میں زہر بھر دیا۔ یہی نہیں اُس نے اپنی پاک دامن بیوی بھانومتی کو طلاق دی۔ پرکاش کا جی چاہتا تھا کہ وہ اُس کے چہرے کو نوچ لے۔ اُس نے اُس کی زندگی میں بھیانک اندھیرا کر دیا تھا۔ جہاں روشنی کا گزر محال تھا۔

ایک دن ساحل کی سیر کرتے ہوئے اُس کو بھانومتی ملی۔ اُس نے کہا۔

"پرکاش سنیلمہ دونوں کو فریب دے گیا۔ کیوں نہ ہم اس فریب خوردہ زندگی کو ایک دوسرے کے ہو کر نئے سرے سے شروع کریں۔"

لیکن پرکاش اب کچھ بھی سوچنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اُس نے کہا۔

"بھانومتی میں ایسا سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوں — عورت نے مجھے دھوکہ دیا۔ دوست نے دوستی کے پاک رشتے کو زخمی کیا۔ اب مجھے کسی پر بھروسہ نہ رہا۔"

وہ وہم اور خوف کا بھی شکار ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دنیا اُس کو پرکاش کہے۔ اس لئے وہ اپنی زندگی کا سرمایۂ حقیقی ان تلخ یادوں کو سمجھ رہا تھا اور ان ہی کے سہارے زندگی گذارنا چاہتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد جب بھی بھانومتی اُس کو ساحل پر سیر کرتے ہوئے ملتی تو وہ کہتا۔

"بھانومتی اچھی ہو۔"

"ہاں اچھی ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔"

"میں بھی اچھا ہوں۔"

اس طرح زندگی کے دس سال بیت گئے۔ اس درمیان نہ جانے کیا کیا طوفان آئے۔ اب اُس کے پاس مرمت کرنے

کی چھوٹی دوکان بھی نہیں تھی۔ بلکہ ایک بڑا کارخانہ تھا۔

لیکن وہ ہر صبح بھانومتی کو ساحل پر ملتا رہا۔ اور آج پہلی بار بھانومتی اُس کو ساحل پر نہ ملی۔ یہ ٹھیک تھا کہ بھانومتی کو دیکھ کر اس کو ایک قسم کا سکون حاصل ہوتا تھا۔ اور تھوڑی دیر وہ ان تلخ یادوں کو بھول جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی زندگی تلخ بن گئی تھی۔ نہیں۔۔۔ اب وہ ان یادوں سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ اب وہ بھانومتی کو اپنانے کے لئے تیار تھا۔ چاہے وینا کچھ بھی کہے۔ وینا نے کب اُس کی فکر کی جو وہ اب دنیا کی فکر کرے۔ وہ بھانومتی کے گھر کی طرف روانہ ہُوا۔ لوگ اُس کو پاگل سمجھنے لگے۔ لیکن وہ اُس کے جنوں کی کیا قدر جانتے

بھانومتی کھو گئی تھی۔ موت نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ پرکاش کو زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ تلخ یادوں سے اگر چھٹکارا پانا بھی چاہئے تو وہ پا نہیں سکتا

●●

اُلجھے

صدیوں سے ننگی بھوکی پیاسی زندگی وہی کی وہی رہی۔
الٹے سیدھے خوابوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے وہی جوش و خروش ــــ وہی دم خم ــــ رواں دواں جذبے وہی جذبے ــــ جن کی بدولت آدم ہمیشہ بشر رہا۔ بشریت برقرار رہنی چاہئے۔ ورنہ آدمی فرشتہ بن جاتا

اور فرشتے ــــ!!

بے حس ہوتے ہیں۔ عمل کے دائرے میں قید ہوتے ہیں۔
سوچنے کی قوت اپنے اندر نہیں رکھتے۔ حکم کے غلام ہوتے ہیں۔
آدمی جذبات کا پتلا ہے۔ سوچنے کی قوت رکھتا ہے۔ لاتعداد خواہشات رکھتا ہے۔

کبھی کبھی بے ہودہ قسم کی خواہش رکھتا ہے۔

جیسے طاہر رکھتا ہے۔

انوکھی خواہش ——!

وہ ایک بار صرف ایک بار رشمی کو برہنہ دیکھنا چاہتا ہے پھر اُس سے ہزاروں بوسے چسپاں کرنا چاہتا ہے۔ تب تک بو سے چسپاں کرنا چاہتا ہے جب تک اُس میں زندگی رہے گی

لیکن دوسرے لمحے وہ خود سے کہتا ہے۔

"یہ گناہ ہے"

وہ اپنے سے سوال کرتا ہے۔

"ثواب کیا ہے؟"

وہ اُلجھ جاتا ہے — خود سے —— اپنے خیالات سے حالات بھی کچھ اچھے نہیں تھے۔ وہ اُس کی دوست کی بیوی تھی۔ ارشد اُس کا بچپن کا دوست تھا۔ دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ گلی ڈنڈے کے کھیل میں اکثر ارشد طاہر سے ہار جاتا تھا۔ طاہر سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا ارشد اس بار بھی ہار جائے گا"

کون ہارتا ہے؟ کون جیت جاتا ہے؟ کوئی نہیں جانتا ہے۔ کوئی نہیں جان پاتا ہے۔ دنیا کے چرخے میں ہر ایک آدمی ہارتا بھی ہے اور جیتتا بھی ہے۔

ارشد ڈاکٹر بن گیا۔ طاہر ڈائریکٹر بن گیا — فلموں "ڈینو"

بکس آفس پر ہٹ ہو گئی۔ تب سے طاہر تین فلموں کو ایک ساتھ ڈائرکٹ کر رہا ہے۔

بمبئی رنگین تھی۔ بمبئی کی اس رنگین دُنیا میں طاہر کی توجہ کا مرکز بہت سی لڑکیاں بن گئیں۔ پھر بھی جودھ پور کی حسینہ اس کے دل پر قابو کر گئی۔ اپنے شہر کی لڑکی تھی۔ باپ کی پسند تھی۔ ماں کا انتخاب تھی۔

حسینہ تھی بھی حسینہ

۔۔۔ بادامی آنکھیں۔ اُبھرا ہوا سینہ کتابی چہرہ اور رنگت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے اُس برقی کی رَو میں آجاتا ہے۔

ارشد ڈاکٹر تھا۔ کیا وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ طاہر اس کی بیوی پر عاشق ہوا ہے۔

طاہر چیخ پڑا۔

"میں اس کو کبھی معلوم نہیں ہونے دونگا۔ وہ میرا دوست ہے۔ میں کبھی اپنے دوست کے اعتماد کو نہیں لوٹ لونگا۔

ارشد ڈاکٹر بن گیا۔ ایم۔ بی۔ بی ایس پاس کیا۔ الف۔ آر سی لندن سے اپنے ساتھ لایا۔ جودھ پور میں مشہور ڈاکٹر بن گیا۔

پچھلے دنوں "ہیروں کی رانی" کی شوٹنگ کے سلسلے میں

جودھ پور گیا تھا۔ فلم کی ہیروئن بیمار ہوگئی۔ سارا یونٹ بیکار ہوگا۔ روزانہ دس ہزار خرچ ہو جاتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر بھی وہی ڈگری پاس والے۔ پھر کسی نے ارشد کا نام لیا۔ طاہر ارشد کے پاس گیا۔ وہاں طاہر کو معلوم ہوا۔ وہ اس کا بچپن کا لنگوٹیا یار تھا۔ دونوں گلے ملے۔ دس سال کی جدائی کی داستان ایک دوسرے کو کہی۔ پھر ارشد نے طاہر کو اپنی بیوی شمی سے ملایا۔

پہلی بار شمی کو دیکھ کر طاہر اپنے خیالات وجذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ لیکن ایک آواز ہر وقت آتی رہتی تھی دوست

—— دوست!!

شمی نے آج کھانے کی میز پر طاہر سے کہا۔

"بھائی صاحب —"

دل چاہتا تھا، وہ اس سے کہے کہ اُس کو بھائی صاحب نہ کہے لیکن نام تو صرف نام ہوتے ہیں۔ رشتے نہیں ہوتے ہیں۔

رشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں —!!

آگے شمی نے کہا۔

"چند دن پہلے میں نے چند فلمی اخباروں میں پڑھا کہ آپ اپنی اگلی فلم کے لئے کسی نئی لڑکی کو بطور ہیروئن لینا چاہتے ہیں۔"

طاہر نے جواب دیا

"آپ نے ٹھیک پڑھا ہے۔ میری کہانی سچ مچ ایک نئے چہرے کی تلاش میں ہے۔"

شمی نے ایک لمبی آہ کے ساتھ کہا۔

"کاش میں بھی فلمی ہیروئن بن سکتی۔"

یہ جملہ شمی نے اس انداز سے کہا کہ سب ہنس پڑے اس کا خاوند کہنے لگا۔

She is very much interested in films

شمی نے کہا

"بھائی صاحب ــــ"

طاہر کے ذہن نے کہا۔

"بھائی صاحب ــــ لوگ کیوں بہت جلد واقعات بھول جاتے ہیں۔"

لیکن طاہر کیسے اُن دنوں کو بھول سکتا ہے۔ جب وہ بی۔ اے کے پہلے سال میں پڑھتا تھا۔ ساتھ ہی گرلز کالج بھی تھا۔ ہر دن چار بجے کے بعد وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر لڑکیوں پر فقرے کستا تھا۔

طاہر لمبی سانس لیتا ہے۔

"بڑے اچھے دن تھے وہ ــــ!"

اُن میں شمی بھی ہوتی تھی اور شمی بھی ایک دو دفعہ اُس کے فقروں کی زد میں آ گئی تھی۔ وہ دھیرے سے ہنستی اور چلی جاتی تھی یا کبھی آنکھیں نکال کر چلی جاتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے شمی کا ہاتھ بھی پکڑا۔

شاید بات آگے بڑھ جاتی۔ شاید وہ شمی کو اپنے قابو میں کرتا۔ لیکن وہ جودھ پور چھوڑ کے چلا گیا۔ پھر اُس کی آنکھ کھلی بمبئی کی فلمی دنیا میں۔ یہاں وہ شمی کو بھول گیا شمی کے ساتھ وہ واقعات بھول گیا۔

پھر طاہر فوراً اپنے ذہن سے سوال کرتا ہے
"کیا شمی اُن واقعات کو بھول گئی۔"

لیکن وہ کیسے بھول جائے گی اُن واقعات کو، وہ سوچتا رہا۔

"شمی بدل گئی ہے"

رات سیاہ تھی۔ نیند کیوں آنکھوں سے بھاگ گئی تھی۔ حسینہ تو کب کی سو گئی تھی۔ شاید کوئی اچھا سا خواب دیکھ رہی تھی۔ تب ہی تو اُس کے چہرے پر مسکراہٹ ہے۔

لیکن طاہر کی آنکھوں میں شمی کی شکل تھی۔ شاید اس لئے اس کی آنکھوں سے نیند فرار ہو گئی ہے۔ پہلی بار شمی اُس کے گھر میں سو رہی تھی۔ شمی اور راشد دونوں طاہر کے

مہمان تھے۔

"ہیروں کی رانی" کی شوٹنگ مکمل کرنے کے بعد طاہر جب ارشد کے پاس بمبئی جانے کے لئے رخصت لینے گیا تو اُس نے ارشد سے وعدہ پورا کیا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں سے نیند چلی گئی۔ آج اپنے اس جوہو کے مکان میں وہ اجنبیت محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ہی گھر میں کبھی کبھی آدمی خود کو مہمانوں کی وجہ سے اجنبی محسوس کرتا ہے۔

"نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟"

طاہر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بستر سے نکلا۔ بدن پر ڈریسنگ گون ڈالا۔

اپنے آپ سے کہا۔

"لائبریری سے کوئی کتاب لاؤں۔"

حسینہ مست نیند میں پڑی تھی۔ آہستہ آہستہ دروازہ کھولا۔ ڈرائینگ روم کو پار کر کے لائبریری میں داخل ہوا۔ وہ خود سے سوال کرتا ہے۔

"کیا پڑھنا چاہئے؟"

"فلسفے کی کتاب"

وہ خود ہی جواب دیتا

"نہیں۔"

کوئی اچھی ناول —!

"نہیں۔"

کوئی اچھی سائینسی کتاب —!

"نہیں۔"

کوئی جنسی کتاب —!

"ہاں — نہیں" پھر وہ سوچ میں پڑ تا ہے۔ لائبریری کی ایک چھوٹی سی الماری میں سے وسکی کی ایک چھوٹی سی بوتل نکالی۔ تھوڑی سی وسکی پیگ میں انڈیلی۔ آہستہ آہستہ پینے لگا۔ پھر کتابوں کی الماری کو دیکھنے لگا۔ اُٹھ پلٹ کے کتابوں کو دیکھنے لگا۔ پھر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ شور ہوا۔

"کون؟" اُس کے گلے سے آواز باہر نہیں آئی۔

"شاید چور گھس گیا ہے۔" وہ سوچنے لگا۔

"اور چور کو پکڑ لینا چاہیے"

اس نے لائبریری کی بتی بجھا دی۔ اندھیرا چھا گیا۔ چور کو پکڑنے کے منصوبے تیار ہوتے گئے۔ آہستہ آہستہ وہ قدم اُس کی جانب بڑھنے لگے۔

وہ خود سے کہتا رہا۔

"اب آگیا! اب آگیا۔"

طاہر نے چور کو پکڑنے کے لئے بازو پھیلائے۔ چور اس کے بالکل قریب آ گیا اور پھر ——— طاہر نے چور کو اپنے بازوؤں میں کس لیا۔

طاہر کہہ پکڑا،

"چور کو پکڑ لیا۔"

چور نے سُریلی آواز میں کہا۔

"کس کو پکڑ لیا"

طاہر نے اپنے بازوؤں میں اس کو کستے ہوئے کہا۔

"تم؟"

شمی نے دھیمی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"میں"

پھر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں کے ساتھ ملا دیئے۔ ایک دوسرے پر بہت بوسے چسپاں کئے۔

شمی نے آہستہ اس کے کان میں کہا۔

"یاد ہے کبھی تم نے میرا بازو گرلز کالج کے سامنے پکڑا تھا۔"

طاہر نے جواب دیا۔

"اور آج تمہارا سارا جسم میرے بازوؤں میں ہے۔"

"آہ" وہ ہنس پڑی۔

"اندھیرے میں سب کچھ نظر نہیں آتا ہے۔" طاہر نے کہا۔
"میں بھی اندھیرے میں نہیں رہنا چاہتی ہوں۔"
بتی جل گئی۔ طاہر نے کہا۔
"تم کیسے یہاں آگئی؟"
"کتاب ڈھونڈنے آئی تھی۔"
دونوں خاموش ہوئے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے
اچانک شمی نے کہا۔
"تمہاری نئی فلم کو مجھ جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔"
طاہر نے کہا۔
"آ۔ ہاں ۔۔ تم جیسی۔"
شمی ہنسی پڑی۔
"مجھ جیسی ۔۔ کام بنتا ہوا نظر آرہا ہے۔"
شمی نے کہا۔
"تمہارے ہاتھ کیوں کانپتے ہیں۔"
"خوف کھاتا ہوں۔"
"تم مرد ہو یا عورت ہو۔"
طاہر خاموش ہو جاتا ہے۔ کوئی کھانستا ہے۔ وہ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ طاہر نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کوئی جاگ گیا۔"
شمی کہتی۔
"میں جاتی ہوں"
وہ اپنے کمرے میں گھس جاتی ہے۔ ارشد کھانستے ہوئے بیدار ہو گیا تھا۔
"تم کہاں گئی تھی ؟"
"باتھ روم تک"
ارشد جواب سُن کے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شمی اُس کے پہلو میں سو جاتی ہے
حسینہ نیند میں محو تھی۔ طاہر بستر میں گھس جاتا ہے۔ چند لمحات پہلے کے واقعات اُس کی آنکھوں کے سامنے پھیر جاتے ہیں۔ منزل کتنی نزدیک تھی۔ کتنی دور ہو گئی۔
لیکن سب ہی "اُلجھے لمحے تھے۔
دوست کی بیوی !!
طاہر نے ذہن کو جھٹکا دیا۔
"کیا بڑا گناہ کرنے والا تھا۔ نجات ملی۔"
حسینہ سو رہی تھی۔ طاہر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں حسینہ کو دھوکہ دوں ــــ نہیں ــــ نہیں ــــ نہیں

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"
لیکن وہ فرشتے نہیں ہے!
فرشتے بے حس ہوتے ہیں!!
پھر داستانوں کی پریوں نے اس کو اپنے گھیرے میں لیا۔
ضمیر اور رشتوں کو بھلا دیا۔
عجیب اور انوکھی دنیا کی رنگین محفل میں اس کو لے
آئیں۔

وہ سو گیا۔!!
پھر ساری رات بارش ہوتی رہی۔
دن کے دس بجے تک سوتا رہا۔ اس دن وہ سٹوڈیو
نہیں گیا۔ گھر میں پڑا رہا۔
بارش تھم گئی۔
دوسرے دن وہ اپنے کام پر گیا۔ دس دن ہو گئے۔
وہ اُلجھے لمحات کی گرفت سے آزاد ہو رہا تھا۔
ایک دن صبح کی چائے پر ارشد نے کہا۔
"تم کو اپنی نئی فلم کے لئے نئی لڑکی ملی۔
طاہر سوچ میں پڑ گیا۔ شمی نے کہا۔
"شاید مل گئی ہے۔"
اس کی آواز شوخ تھی اور معنی خیز تھی۔

لیکن طاہر صرف یہ کہہ سکا۔
"ابھی تلاش جاری ہے"
ششی کا منہ لٹک گیا۔ طاہر سوچ میں پڑ گیا۔ دوسرے
دن طاہر بیمار پڑ گیا۔ وہی سر درد اور بخار تھا۔ صبح ہی صبح ارشد
ڈاکٹروں کی کانفرنس اٹینڈ کرنے گیا۔ طاہر اور حسینہ کو ایک ادا
کارہ کی پارٹی میں جانا تھا۔ لیکن طاہر اب نہیں جا سکتا تھا۔ بہرحال
حسینہ کو جانا تھا۔

طاہر نے حسینہ سے کہا۔
"ششی کو ساتھ لے جاؤ"
"اس کے سر میں درد ہے وہ جانا نہیں چاہتی ہے"
وہ تنہائی چاہتا تھا۔
"نہیں اُسے ساتھ لے جاؤ۔"
لیکن وہ کہہ نہ سکا۔ خاموش رہا۔ حسینہ چلی گئی۔
کڑی دھوپ تھی۔ جھلس دینے والی آگ سے سارا بدن
جلتا تھا۔ پیاسے ہونٹ ایک پانی کے لئے ترستے تھے۔ اس
کی آنکھیں بند تھیں۔ کسی کا نرم و نازک ہاتھ اُس کے ماتھے پر
پڑا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ ششی کا ہاتھ تھا۔ اُس نے دھیمی آواز
میں کہا۔
"تم"

"بخار میں تپ رہے ہو۔"
اُس نے کہا۔
"پانی دو۔"
شمی نے کہا۔
"پیاسے ہو"
وہ خاموش رہا
بخار ہے!
کڑی دھوپ ہے!!
شمی ہے!!!
ایک ہی گھونٹ میں پانی کا سارا گلاس حلق سے نیچے اُتار لیتا ہے۔ شمی اس کے پسینے سے تر بتر چہرے کو اپنی خوشنما رومال سے پونچھتے ہوئے کہتی ہے۔
"تمہاری نئی فلم کو نئی لڑکی ملی۔"
وہ خاموش رہتا ہے۔
وہ کہتی ہے
"تمہارے ذہن میں اس لڑکی کی کوئی تصویر ہے۔ اس کا قد کتنا اونچا ہونا چاہئے۔ میرا جیسا قد ہونا چاہئے۔ بازو شاید میرے جیسے لہراتے ہوئے بازو۔ اور......"
طاہر کے ذہن کا آتش فشاں پھٹ گیا۔ اُس کے پاؤں خودبخود

بستر سے باہر آگئے۔ وہ اپنے پیاسے ہونٹ سے اُس کے جسم پر
بوسے چسپاں کرنے والا ہی تھا کہ شمی کہہ پڑی۔
"ہمیں بھی کچھ ملنا چاہیئے۔"
"کیا؟"
شمی ہنس پڑی۔
"بھولے کیوں بنتے ہو راجہ۔ تمہاری اگلی فلم کی ہیروین
میں ہونگی۔"
طاہر چونک پڑا
"سودا۔"
شمی نے اپنی ہنسی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔
"وہ بھی کاغذ پر"
طاہر حیرانگی میں بول پڑا۔
"تم اس جسم کی قیمت چاہتی ہے۔"
"ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے"
"لیکن میں اس جسم سے پیار کرتا ہوں۔"
"بکتے ہو۔ تم ہوس کی محبت کہتے ہو۔"
"تم اپنے جسم سے دام وصول کرنا چاہتی ہو۔ یہ تو طوائف
کا کام ہے۔" طاہر نے گھمبیر آواز میں جواب دیا۔ شمی کے جذبات
مجروح ہوگئے۔ وہ چیخ پڑی۔

"میں طوائف کا کام کرتی ہوں اپنا مقصد پانے کے لئے۔
تم دوست کی بیوی کو اپنے بازوؤں میں لینے کے لئے اس لئے
بیتاب ہو رہے۔ تاکہ تم اپنی جنسی پیاس بجھا دو۔ تمہارے
پاس بھی مقصد ہے۔ میرے پاس بھی مقصد ہے۔ ہر ایک کے پاس
مقصد ہوتا ہے۔"

طاہر ٹوٹ گیا۔ پھٹا ہوا آتش فشاں پہاڑ سرد ہو گیا۔

"ہر کام مقصد کے لئے ہوتا ہے۔ کچھ کام ضمیر کے لیئے ہوتے
ہیں۔ تم چلی جاؤ ــــ چلی جاؤ۔"

شمی خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ جاتے ہوئے
کہتی ہے۔

"اب تمہیں بلانا ہوگا۔"

وہ خاموشی سے بستر میں گھس جاتا ہے۔ آسمان پر بادل
پھیلنے لگے۔

پھر اناپ شناپ فکریں اس کے ذہن میں پھیلنے لگی۔

دوست ــــ! ضمیر ــــ!! ــــ مقصد ــــ!!!

پھر سب کچھ ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔

اچانک وہ خود سے کہتا

"ضمیر کے جھانسے میں آ گئے۔ دوستی کے جال میں پھنس گیا۔
اور اپنا مقصد فوت کر گیا۔"

سیاہی کا پردہ گر گیا۔ ضمیر پتھر بن گیا۔ جذبات بے قابو ہو گئے
وہ دوڑتا ہوا ــــــ اوپر گیا۔
شمی نے طنز بہ آواز میں کہا۔
"موقعہ کھو دیا"
طاہر نے کہا۔
"میں مرد ہوں۔"
شمی نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔
"آ ــــ تم عورت سے بھی بدتر ہو۔"
طاہر نے اپنے سینے کو ٹھوکتے ہوئے کہا۔
"میں مرد ہوں مرد ــــ مرد ــــ مرد۔"
پھر وہ ہنس پڑا ــــ قہقہہ لگایا ــــ قہقہہ لگایا۔
شمی احتجاج کرتی رہی۔
پھر قہقہے تھم گئے۔ چیخیں بند ہو گئیں۔
وہ سر کو دباتے ہوئے بستر میں پڑا ہوا تھا۔
کالے بادل گرجے۔ جذبات میں بھی گرج پیدا ہو گئی ــــ
اب اختیار میں کچھ نہ رہا۔
وہ چیخ پڑا۔
"شمی کہاں گئی ہے؟"
پھر وہ اپنے آپ میں توانائی لاتے ہوئے ڈرائنگ روم

کی طرف چل پڑا۔
شمی جا رہی تھی۔ طاہر کہہ پڑا۔
"رک جاؤ شمی ـــ رک جاؤ۔"
وہ رک گئی۔ ستون کی طرح کھڑی کی کھڑی رہی۔
وہ خود آگے بڑھا کانپتے ہوئے ہاتھوں میں اُس کا جسم لیا۔
وہ قہقہہ لگاتی رہی
پھر کہتی رہی۔
"تم کمزور ہو ـــ کمزور ہو ـــ کمزور ـــ کمزور۔"
وہ اوندھے لیٹ گیا۔ لیکن کانوں میں صرف ایک ہی لفظ
تعاقب کر رہا تھا۔
"تم کمزور ہو۔"
لیکن وہ سب تصور کے خاکے تھے۔ جو بنتے رہے مٹتے رہے۔
وہاں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے اپنی بوجھل آنکھوں کو کھولا اور
محسوس کیا کہ وہ فرشتہ بن گیا ہے۔
وہ ایک آہ کے ساتھ کہہ پڑا۔
"فرشتہ"
فرشتے بے حس ہوتے ہیں۔ عمل کے دائرہ میں قید ہوتے ہیں
حکم کے غلام ہوتے ہیں۔
بارش برسنے لگی۔

پرستی رہی۔

دس دن ہو گئے۔ دس دن کے بعد جب پہلی بار اُس نے آنکھ کھولی۔ تو اس نے اپنے اوپر اپنی بیوی کو جھکا ہوا پایا۔ اس کی بیوی نے اطمینان کی سانس لی اور کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ زندگی کے دائرے میں داخل ہوئے"

"آ" طاہر نے گہری سانس لی۔ "ارشد اور شمی کہاں گئے ہیں؟"

"آپ پندرہ دن سے بخار میں مبتلا رہے ہیں۔ اب ہوش آیا۔" حسینہ نے آگے کہا۔

"ارشد اور شمی دونوں نہیں جانا چاہتے تھے۔ لیکن ارشد کی ماں سخت بیمار ہو گئی تھی۔ اس لئے اُن کو جانا پڑا۔"

وہ سوچتا رہا۔

"شمی گئی تو"

پھر اپنے آپ سے کہہ پڑا۔

"میں تو فرشتہ بن گیا ہوں۔"

وہ سمجھ نہیں پاتا کہ وہ فرشتہ ہے یا کہ انسان ہے یا کچھ بھی نہیں ہے۔

●●

اندازہ

"اب تصویر بناؤ"

لڑکی کی سریلی آواز نے مجھے سوچ کی دنیا سے واپس لایا۔ کینویس ایزل پر چڑھ گیا تھا۔ اب صرف کینویس پر رنگوں کو پھیلا دینا تھا۔

اور ـــ اب ماڈل گرل بھی تیار تھی۔

وہ دراز قد کی پتلی سی لڑکی۔ بہت گوری بھی نہیں تھی۔ لیکن اس کے نقوش بڑے تیکھے ہیں۔ اس کا سڈول جسم پچاس ساٹھ روپے کی ساڑھی میں بند تھا۔

میں نے لکیروں کا انداز پکڑا۔

لکیروں نے عجیب مگر بہت زیادہ پُرکشش پیچ وخم اختیار کیے۔ "میں فنکار ہوں حسن کی تعریف کرنا میری فطرت ہے۔" میں نے لڑکی سے کہا۔

لڑکی کے چہرے پہ تبسم پھیل گیا۔ مگر بہت جلد اُس کے چہرے

پر سنجیدگی واپس آ گئی۔
اس نے مختصر سا جواب دیا۔
"میں ماڈل گرل ہوں۔"
"لیکن حسین تو ہو"
"وقت ضائع مت کرو۔ ورنہ خرچ کرتے رہو گے اور خود بھوکے رہو گے۔"
"تم ہر بار کیوں کاروبار کے ترازو کو سامنے لاتی ہو؟"
اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کیونکہ میں ماڈل گرل ہوں اور میری اُجرت فی گھنٹہ دس روپے ہے۔"
میں نے معلوم کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن اس سے تمہارا کیا نقصان ہے؟"
"نقصان ہے۔ ورنہ میں تمہیں کیوں ٹوکتی۔ تصویر جو صرف پانچ گھنٹے میں مکمل ہو گی۔ مثال لو۔ وہ تصویر ساٹھ روپے میں فروخت ہو گی۔ تمہیں نفع ہو گا۔ مگر وہی تصویر اگر پانچ کے بدلے دس گھنٹے میں مکمل ہو گی۔ پھر ساٹھ روپے میں فروخت ہو گی۔ تمہیں بھی نقصان اور مجھے بھی۔ تمہارا کاروبار ٹھپ ہو گا۔ میری آمدنی کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گا۔ بتاؤ — اس طرح میرا نقصان ہو گا نا"
یہ ایک اچھا کاروباری نقطہ تھا۔ لیکن میں مصور رہوں۔

کوئی کاروباری نہیں ہوں۔ اگر میں غم اور مجبوریوں کے دلدل میں پھنسا ہوا ہوں پھر بھی آنکھیں کھولنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ایک اندھی دوڑ دوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں

میں نے اچانک اپنی ماڈل گرل سے کہا۔

"تم نے کبھی پیار کیا ہے؟"

"پیار کے لئے فرصت ہونی چاہئے مسٹر"۔ اُس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "مجھ جیسی ماڈل گرل کی دنیا بے حس ہوتی ہے۔ ہمارے دل میں دھڑکن پیدا نہیں ہوتی۔ وقت کی تند اور تیز ہوائیں نے اُس کو پتھر بنا دیا ہوتا ہے۔ غربت کی چھاؤں بڑی ظلم ہوتی ہے۔"

میں نے سوچ کر کہا۔

"دنیا کے حوادث انسان کو تبدیل کر کے رکھتے ہیں۔ ذہنوں کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ زندگی کے رُخ کو موڑ کر کے رکھتے ہیں مگر پھر بھی آدمی دل کے سہارے حیات کی لمبی دوڑ طے کر لیتا ہے بے حس دل والے بت بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ زمانے کے ہاتھوں کھلونے بن جاتے ہیں۔" ماڈل گرل مجھے تھوڑی دیر کے لئے تکتی رہ گئی۔

"تم تصویر بناؤ"۔

لیکن اس کی آواز میں اطمینان نہیں تھا۔ ایک بے چینی تھی۔

اضطراب تھا۔ کشمکش تھی۔ وہ وقت کے ہاتھوں بت بن گئی تھی۔ وہ صرف ماڈل گرل تھی۔ صرف ماڈل گرل۔ میں نے ہاتھ میں پنسل سنبھالا۔ کاغذ پر میرا ہاتھ تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔ اچانک میں نے اُس سے کہا۔

"تمہارا نام؟"۔

"ماڈل گرل"۔

"لیکن جب تو ماڈل گرل کے قالب سے آزاد ہوتی ہے۔ تب تمہارا نام کیا ہوتا ہے؟"۔

"وہ نام" وہ مسکرا پڑی "آشا ـــــ جس کی ساری زندگی نراشا کی شاہکار بن کے رہ گئی ہے"۔

"یہ سوچنے کا ڈھنگ ہے۔" میں نے کہا۔ "انسان خود احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اپنی دماغی الجھنوں سے خود ہی ایسا جال تیار کر لیتا ہے کہ خود کو اس جال میں بے بس اور بے کس پاتا ہے"۔

میں یہ کہہ کے خاموش ہوا۔ وہ بھی کچھ سوچ رہی تھی۔ میں بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ مگر سوچ کے زاویے مختلف تھے۔ زندہ رہنے کے لئے مختلف انداز تھے۔

[illegible] نے ہماری زندگی میں زہر بھر دیا ہے۔ وقت کا غلام [illegible] زندگی کی ہمیشہ ختم کر دی۔ زندگی کی حرارت میں سردی [illegible] ذہن غلام، سوچ غلام، زندگی غلام سب کچھ ہم سے

مادیت کا غلام بنایا۔

لیکن ——— میں کب تک سوچتا رہوں گا۔ میں نے ایک دفعہ پھر پنسل اُٹھایا۔ اور میں تصویر بنانے میں محو ہوا۔ لیکن ہاتھ میرے قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ خود بخود کاغذ پر لکیریں کھینچتا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر میرا ہاتھ بہرا یا کیوں بن گیا تھا۔ اور پھر ایک ایسی تصویر بنا ڈالی جس کا تصور تک میرے ذہن میں نہیں تھا۔ اچانک میں نے آشا سے کہا:

"تصویر نہیں بن سکتی۔ تم بنا سکتی ہو۔"

میں نے اب تصویر ہاتھ میں پھاڑنے کے لئے اٹھایا۔ آشا نے میرا خیال پڑھا اس لئے اُس نے کہا۔

"تم تصویر نہیں پھاڑ سکتے ہو۔"

میں نے اُس کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"تم پیچھے لیے ہی ڈیڈی ادھر چلی جاؤ۔"

"میں تصویر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"تصویر نہیں بنی۔"

"جھوٹ بولتے ہو۔" آشا نے کہا۔

"ہاں ——— ہاں میں جھوٹ بولتا ہوں۔" میں چیخ پڑا۔

"لیکن مجھے یہ جھوٹ بولنے دو۔ یہ جھوٹ اُس تلخ سچائی سے بہتر ہے جو دل کو ٹھیس لگا دے۔"

آشا تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہی۔ پھر میرے ہاتھ سے تصویر لی۔

وہ بڑبڑائی۔

"میرے جسم پر کوئی کپڑا نہیں ہے۔ میں ننگی ہو گئی۔ لیکن ـــــ کیوں ـــــ کیوں تمہارے قلم نے مجھے ننگا کیوں کیا۔ برہنہ کیا ـــــ بنا دیا؟"

میں بوکھلا گیا۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پاتا تھا۔ میں نے کہا۔

"مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ میں نے لاکھ چاہا کہ قلم کو لگام دوں۔ قبضہ میں رکھوں۔ لیکن وہ بے قابو ہو گیا۔ میرے اختیار میں نہیں رہا۔"

وہ سوچ میں کھو گئی۔ میں اپنی حرکت پر نادم تھا۔ لیکن قلم دھوکہ دے گیا۔ حقیقت کو پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ ہزار بس کو بہکا دے۔ مگر بہک نہیں سکتا۔ میں اسی سوچ میں محو تھا۔

"اب ـــــ اب میں کیا کروں؟"

آشا کی آواز آگئی۔

"مجھے برہنہ ہونے سے بچاؤ۔"

میں نے طنز یہ آواز میں کہا۔

"محبت پر تمہیں یقین نہیں ہے۔"
آشا نے مایوس آواز میں کہا۔
"لیکن ـــ!"
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"تم تو کب کی ننگی ہو گئی ہو؟"
اب آشا نے اعتماد بھری آواز میں کہا۔
"لیکن تمہارے دل میں محبت ہے نا ـــ تم ـــ فنکار ہو ـــ نا۔"
میں کچھ کہہ نہ سکا۔ بطور اعتراف میرا سر جھک گیا۔ پھر اُس کے ہاتھ سے تصویر لی۔ اور ـــ اب تصویر برہنہ نہیں رہ سکتی تھی۔



پردہ

وہ مجھے اس انداز سے ملی کہ جیسے میں اس کو پہلے کبھی ملا ہی نہ ہوں۔ اُکھڑی اُکھڑی، اجنبی اجنبی، تھوڑی دیر میں بھی اسی حیرت میں مبتلا رہا کہ شاید میں نے اُس کو خواب میں دیکھا ہوگا۔ لیکن بھلا میں یہ کیسے بھول جاتا کہ میں نے اُس کے آٹوگراف بُک پر غالب کا یہ شعر لکھ دیا تھا۔ ؎

بلائے جان ہے غالب اُن کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا ادا کیا

وہ دن تو میری زندگی کا حسین ترین دن تھا۔ اُس دن میں اُس یادگاری مشاعرے پر ایسے چھا گیا کہ تالیوں اور "واہ ___ واہ" کی آوازوں سے سامعین نے ہال سر پہ اُٹھایا۔ جب شعر و شاعری کی وہ عظیم مجلس ختم ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو آٹوگراف لینے والوں کے نرغے میں پایا اور اس ہی نرغے میں مجھے یہ لڑکی ملی تھی۔ حقیقت

تو یہ ہے کہ اس لڑکی کی شکل و صورت نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ لیکن مجھے اس تک رسائی حاصل نہ ہوئی۔ اور نہ ہی پھر کبھی اس کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اس لئے محبت کا سلسلہ بھی شروع نہ ہوا۔

اب میری دوسری ملاقات اس لڑکی کے ساتھ میرے دوست کرامت علی کی شادی پر ہوئی۔ میرے دوست نے اس لڑکی سے مجھے ملاتے ہوئے کہا۔

"ذکیہ بہن یہ میرے دوست انور احمد انور ہے۔ بڑے اچھے شاعر ہیں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"نام تو سنا تھا۔ لیکن اب تک ان کو ذاتی طور نہیں دیکھا تھا۔"

لیکن میں ذکیہ کو پہلی نظر میں پہچان گیا۔ میں نے کہا۔

"میں تو آپ کو ——"

ذکیہ نے بیچ میں بولا۔

"پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید کسی اور لڑکی کے ساتھ آپ مجھے گڑبڑ کر رہے ہیں۔"

اس لڑکی کی یہ ادا میرے لئے معمّہ بن گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس وہم میں مبتلا ہوا کہ کہیں اس لڑکی کو بھول جانے کی

بیماری نہ ہو۔ پھر بھی میں ذکیہ کو چاہتا تھا شاید اُس کو بھی میری آنکھوں میں وہ چمک نظر آئی۔ اس لیے شادی کے ہنگامے میں جب وہ میرے پاس سے گزرتی تو وہ اپنی نگاہوں کو نیچے کر کے چلی جاتی تھی۔ اس طرح اُس بار بھی محبت کا سلسلہ جاری نہ ہوا۔ سلسلہ تب ہی جاری ہوتا جب کوئی خاطر خواہ جواب ملتا ذکیہ کی خاموشی نے میرے سب ہی حوصلے پست کیے۔

زندگی ایک اُلجھن ہے۔ آجکل زندگی میں غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں رہتا ہے۔ میں اپنے شہر سے بہت مدت تک بے خبر رہا۔ اسی دوران میرے دوست کرامت علی کی چچیری بہن بھی مر گئی۔ میں صرف اُس کو تعزیتی پیغام بھیج سکا۔ نوکری والے آدمی کو نوکری کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ پھر میرا تبادلہ واپس اپنے شہر ہوا۔ ان ہی دنوں میرے والدین کو میری شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ میں گھروالی لانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ پھر تو ٹھہرا آزاد طبیعت کا آدمی اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ والدہ ہر دن لڑکیوں کا تذکرہ کرتی رہتی تھی اور کبھی کبھی اور کسی کسی لڑکی کا فوٹو بھی دیکھ لینے کو دیتی تھی۔ لیکن میں ہر دن کوئی بہانہ بنا کے بات کو ٹال دیتا تھا۔ کبھی کہتا۔

"امی اس کی ناک چھوٹی ہے۔"

"اس کا سب کچھ تو ٹھیک لیکن اس کی آنکھیں بلی کی جیسی

ہیں"

"اس کے بالوں سے لگتا ہے کہ یہ زبردست فیشن پرست لڑکی ہے۔"

اور پھر ایک دن خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹ گیا۔ جب میرے ہاتھ میں ذکیہ کی تصویر آئی۔ امی نے کہا۔

"بیٹے لاکھوں میں ایک لڑکی ہے۔ چراغ لے کے ڈھونڈنے نکلو تو بھی ایسی لڑکی نہیں ملے گی"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امی جب تمہیں یہ لڑکی پسند ہے تو مجھے بھی یہ لڑکی پسند ہے۔"

والدہ میرا جواب پا کے بہت مسرور ہو گئی اور دعا دینے لگی۔ لیکن میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگا۔ جس کو چاہا اُس کو پایا۔ خدا بھی کبھی کبھی کسی معاملے میں ڈرامائی انداز اختیار کرتا ہے۔

ذکیہ کے ساتھ میری شادی طے ہوئی۔ شدت سے اُس دن کا انتظار کر رہا تھا جب ایک بار اپنے حجرۂ عروسی کے کمرے میں ذکیہ سے ملوں اور اس سے کہوں گا۔

"اب مجھے پہچانتی ہو۔ میں وہی ہوں جو تم کو سب سے پہلے مشاعرے میں ملا اور تمہاری پہلی نظر سے گھائل ہوا۔"

نہ جانے میں شادی کے دن کیا کیا سوچتا رہا۔ آخر وہ دن آ ہی

گیا۔ جب میں دولہا بنکر گھوڑے پر گیا اور ڈولی میں ذکیہ کو دُلہن بنا کے لایا۔ اس دوران انتظار کا ایک ایک لمحہ قیامت خیز بن گیا۔

پھر میں نے تھوڑی ہی وقت کے بعد اپنے آپ کو حجرہ عروسی کے کمرے میں پایا۔ میں اپنے ماتھے کے پسینے کو اپنے رومال میں جذب کرتے ہوئے پایا۔ ذکیہ سرخ ساڑھی میں ملبوس ایک گٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ اُس کا گھونگٹ اُٹھایا اور اس سے کہا۔

"پہچانتی ہو مجھے ـــــ آ ـــــ جواب دو۔"

میرے بے حد اصرار پر اُس نے نرم آواز میں جواب دیا۔

"بھائی کرامت علی کی شادی پر دیکھا۔"

"غلط" میں نے کہا۔ "تم نے مجھے اس سے پہلے ایک مشاعرے پر دیکھا ہے۔"

اس نے جواب دیا

"لیکن میں آج تک مشاعرے پر کبھی نہیں گئی ہوں۔"

میں پھر اُلجھن میں پڑ گیا۔ لیکن میں ایسی قیمتی سہاگ رات کو اس اُلجھن کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سہاگ رات چلی گئی۔ پھر صبح آگئی۔ ذکیہ نے باتھ روم جانے سے پہلے اپنے ایک سوٹ کیس سے کچھ کپڑے نکال لئے۔ اچانک میری نظر سوٹ کیس کے

اندر چلی گئی۔ تو میں ایک ڈائری اُس میں پائی۔ اس ڈائری کی حقیقت جاننے کے لئے مجھ سے ایک غیر اخلاقی حرکت سرزد ہوئی۔

ڈائری کے صفحے گردانتے ہوئے مجھے ایک صفحے پر اپنا دستخط اور میرے ہاتھ سے غالب کا لکھا ہوا شعر ملا۔ اس شعر کے نیچے لکھا تھا۔

انور میرے خوابوں کا راجہ ہے

شاہدہ

میں نے سوٹ کیس میں ڈائری واپس رکھ دی۔ ایک بار میں پھر الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ذکیہ کے باتھ روم سے واپس آتے ہی میں نے اُس سے کہا۔

"ذکیہ کیا تم ڈائری رکھتی ہو؟"۔

"میں تو ڈائری نہیں رکھتی ہوں۔ ہاں البتہ شاہدہ رکھتی تھی"۔

"شاہدہ کون؟"۔

"شاہدہ میری بہن تھی"۔ اس نے کہا "کرامت بھائی کی شادی سے چند دن پہلے اُس کو معمولی بخار آنے لگا۔ کرامت بھائی کی شادی کے چند دنوں بعد اچانک وہ سخت بیمار ہو کر فوت ہو گئی"۔

"کیا وہ تمہاری بڑی بہن تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"نہ وہ میری بڑی بہن تھی نہ ہی چھوٹی۔ ہم دونوں ایک ساتھ پیدا ہوئیں۔ اگر آپ اُس کو اور مجھے اکھٹے دیکھتے تو فرق نہ کر پاتے۔ ہم دونوں ہم شکل تھے۔"

میں نے خود سے کہا۔

"تو وہ شاہدہ تھی جو مجھے مشاعرہ پر ملی تھی۔"

لیکن میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اِس حقیقت پر پردہ ہی رہتا۔



دل والی

ایک نرس کو دیکھکر نہ جانے میں کیوں رُک جاتا ہوں اور رُک کر اس کو تکتا ہوں۔ نفسیاتی طور پر مجھے عورتوں کے جدید لباسوں میں نرس کا لباس سب سے زیادہ پسند ہے۔ میرے دوست امتیاز نے مجھ سے ایک دن کہا۔

" واللہ تمہاری پسند بھی کیا پسند ہے۔ عورت کا لمبا سفید لباس پسند ہے۔ ارے انسان بنو ـــــ اور انسان بنکر رنگ برنگی ساڑھیوں کے پرستار بن جاؤ۔"

یہ تو دو سال پہلے کی بات ہے۔ لیکن بقول امتیاز میں لمبے سفید لباس کے سوا کسی اور چیز کا پرستار نہ بن سکا۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں ایک سفید لباس کو دیکھکر نہ صرف دیکھتا رہا بلکہ اس کو تکتا بھی رہا اور اس پر مر مٹا بھی۔ پہلی بار

میں نے اس کو تلک برج کے نرسنگھ ہوم سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس وقت نرسوں کے لباس میں غضب ڈھا رہی تھی۔ ایک مصوّر کے خوابوں کی شہزادی لگ رہی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑی ہو کر کسی کا انتظار کرنے لگی۔ میں موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے پاس ہی کھڑا ہوا۔ یوں تو حسن ہمیشہ بے نیاز ہوتا ہے۔ اسلئے وہ ایسی کھڑی رہی جیسے میں اس کے پاس کھڑا ہی نہ تھا میں اپنے آپ سے سوال کر بیٹھا۔

"کیا یہ پتھر کی مورتی صدیوں اسی طرح کھڑی رہے گی؟" لیکن میں عاشق تھا ایک ایسا عاشق جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی محبوبہ سے کہہ ہی بیٹھا۔

"آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہے؟"

میم صاحبہ نے کوئی جواب نہ دیا جیسے میں بک رہا تھا۔ میرا خونِ عشق گرم ہو گیا۔ گرم ہو کر جب اُبلنے لگا تو میں نے کہا:

"محترمہ میں نے آپ سے سوال کیا تھا کہ کیا بجا ہے؟ لیکن جواب ندارد۔ کیا بات ہے ہاں آپ نے جو اچھی شکل پائی۔ اسلئے آپ کسی کی بات کا جواب دینا گوارا نہیں کرتے۔"

"مسٹر" حسن کو ٹھیس پہنچائی اسلئے جھنجھکر کہا: "آپ پرانے لوفر لگتے ہیں۔ زبان سنبھال کر بات کیجیے۔"

"شکر خدا کا۔" میں نے کہا۔ "آخر کفر ٹوٹ ہی گیا۔"

"مسٹر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

حسینہ نے آگے آ کے بے باکی سے مجھ سے سوال کیا۔ میں حیران ہو کے اپنی بغلیں جھانکنے لگا۔ کم از کم میں اتنا بے باک نہ تھا۔ ابھی تو میں جھلین کا شکار ہی تھا مجھے یاد ہے کہ لوگ چاند پر گئے لیکن میں اب بھی عشق کے پیچ و خم سنوارنے میں سال ہا سال صرف کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے بھی بے باک ہو کر کہا

"حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے مجھے متاثر کیا۔"

"جی ہاں میرے اس چہرے نے آپ کو متاثر کیا ہو گا؟"

نرس نے آگے کہا

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہر ایک کو اپنا چہرہ حوالے کرتے پھروں۔"

"نہیں" میں نے کہا۔ "لیکن مجھ جیسا نوجوان جب کسی حسین لڑکی کو یہ کہے کہ مجھے آپ کے چہرے نے متاثر کیا۔۔۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس لڑکی کو اپنانا بھی چاہتا ہے۔"

"تو"

وہ بڑبڑا اٹھی۔ لیکن رک گئی۔

یہ تھی میری اور اس کی پہلی ملاقات ۔۔۔ اس کا نام سیتا تھا ۔۔۔ اور ۔۔۔ میں رام تھا۔ سیتا اور رام کی جوڑی کبھی LAGUNA ریسٹورنٹ میں نظر آتی تو کبھی ریگل کے سینما ہال میں۔ میرا دوست

امتیاز مجھ سے کہتا ہے۔

"تو صاحب آخر ایک نرس کے سفید لباس پر مر مٹ ہی گئے۔"

میں مسکرا دیتا تھا۔ وہ آگے کہتا:

"لیکن یار ہم کو ملاؤ نا — اُس لڑکی سے جس نے تیرا دل چھین لیا۔"

"ملادوں گا دوست۔"

میں جواب دیتا۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لیکن میں نے کبھی امتیاز کو سیتا سے نہ ملایا۔

"دل میں ٹھانی تھی کہ شادی کے بعد ہی امتیاز کو سیتا سے ملا دوں گا۔"

میں نے ایک دن سیتا سے کہا:

"چلو سیتا آج کورٹ میں سول میرج کریں گے۔"

"رام — کردینگے — میرج — اتنی بھی جلدی کیا ہے۔"

میں خاموش ہوا۔ میں نے ہوٹل کے بوائے کو بلایا۔

"ذرا ایک گلاس پانی کا دو۔"

"یس سر"

"بوائے یہ کہہ کے چلا گیا۔ سیتا ہنس پڑی۔ اُس نے کہا:

"میرے جواب سے اتنی پیاس بڑھ گئی۔"

"جی ہاں"

"میں غصے سے جل اٹھا۔ اسی اثنا میں میرے کندھے پر کسی کا ہاتھ

پڑ گیا۔ میں مڑا تو دیکھا وہ میرا دوست امتیاز تھا۔ امتیاز نے کہا:

"سلام"

"امتیاز تم"

"جی ہاں زندہ ہی ہے۔"

"سیتا" میں کھڑا ہو کر سیتا سے کہنے لگا۔ "یہ میرا اکلوتا دوست امتیاز نعمانی۔ میجر نعمانی کا بیٹا۔"

"میجر نعمانی کا بیٹا"

نہ جانے یہ نام سنکر وہ کیوں چونک پڑی لیکن میں نے اس بات کو اہمیت نہ دی۔ کیونکہ میجر نعمانی ایک ایسا آدمی تھا جس کے جنگی کارنامے افسانے بن گئے تھے۔ اسلئے اکثر لڑکیاں اس کا نام سنکر چونک پڑتی تھیں۔

امتیاز گھمبیر ماحول میں اپنی زندہ دلی سے جان لائی۔ اس نے کہا۔

"بھابھی جی —— میرے بھائی کو اتنا نہ ستانا کہ کبھی یہ اپنے بھائی امتیاز کا نام بھی بھول جائے۔"

وہ مسکرا پڑی۔ ماحول میں ایک بار پھر رنگینی آگئی۔ امتیاز لمبے بے وزن شعر سناتے جا رہا تھا اور میں داد پر داد دیے جا رہا تھا۔

امتیاز کے جانے کے بعد پھر ہم دونوں اکیلے رہے۔ سیتا نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا:

"رام —— کل ہے نا —— سوموار —— ہفتے کا پہلا دن ——

اچھا دن ہے۔ کیوں نا ہم کل کورٹ میں جا کر شادی کریں۔"

میں نے برجستہ جواب دیا۔

"میں نے تھوڑی دیر پہلے تو ایسا ہی کیا تھا اور آپ کا جواب سنکر مجھے پانی کا گلاس منگانا پڑا۔"

"او ــــ تم ــــ شیطان۔"

وہ ہنس پڑی

پھر ہم دونوں اس بات پر متفق ہوئے کہ ہم کل شادی کے لیے کورٹ میں جائیں گے۔ یوں تو نہ اس کا کوئی رشتہ دار نہ ہی میرا کوئی رشتہ دار تھا۔ پر تو ہم دونوں نے پہلے ہی فیصلہ کیا تھا کہ شادی خاموش طریقے سے ہوگی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ پھر شادی کے بعد مقامی ہوٹل میں اپنے چند مخصوص دوستوں کو ٹی۔ پارٹی دینگے

ہم دونوں اس شام نئی صبح کیلئے نئی امنگیں اور نئے جذبات لئے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ گھر پہنچتے ہی میں نے اپنے لئے خود چائے بنالی، سٹوپ کو دیکھکر میں مسکرا پڑا ــــ اور اس سے کہنے لگا۔

"فکر مت کرو ــــ اب تو گھر والی آرہی ہے۔ وہ تمہاری اچھی طرح دیکھ بھال کرے گی۔"

گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں مادی دنیا سے خیالی دنیا میں پہنچ گیا۔ جہاں میں نے اپنے آپ کو ایک وسیع ملک کا بادشاہ

پایا اور سیتا کو اپنی ملکہ پایا۔ حسن کے ایک ہی حکم پر ہزاروں لونڈیاں جھک کر کھڑی ہوئی تھیں۔

اچانک کسی نے اس خیالی دنیا کو تتر بتر کیا۔ کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ میں نے اپنی نیند بھری آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے مسل دیا۔ پھر ایک انگڑائی لے کر کھڑا ہوا۔ دروازہ کھولا۔ سامنے اپنے دوست امتیاز کو پایا۔ میں نے حیراں ہو کر اس سے کہا:

"امتیاز تم اس وقت؟"

"ہاں میں۔"

اس نے گمبھیر آواز میں جواب دیا۔ اس نے آگے کہا:

"میں ایک حقیقت تم کو بتانے آیا ہوں۔ سیتا [illegible]

"کیا بات ہے ـــــ بتاؤ ـــــ امتیاز ـــ کیا بات ہے؟"

میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ سکون کے ساتھ کرسی پر بیٹھا اور کہنے لگا:

"تمہاری شادی سیتا کے ساتھ ہو رہی ہے نا۔"

"ہاں"

"نہیں ہوگی۔"

"امتیاز کیا بات ہے تم پہیلیوں میں کیوں کرتے ہو؟"

"اس بات کو اب پہیلی ہی رہنے دو۔"

"نہیں امتیاز بتاؤ ـــ کیا بات ہے؟"

میں اضطراب میں ڈوب گیا تھا اس نے کہا
"سینتا پہلے ملٹری ہسپتال میں نرس تھی نا۔"

"ہاں"

"اُن دنوں بھی وہی نرس تھی نا۔ جن دنوں جنگ ہوئی۔"

"ہاں ـــ ہاں ـــ آگے بتاؤ۔"

"وہ ملٹری کے اُس ہسپتال میں کام کرتی تھی جس پر ایک دن بم پھٹ گیا۔ اور وہ جل گئی تھی۔ اس کا آج کا چہرہ اپنا نہیں ـــ وہ پلاسٹک سرجری سے بنایا ہوا چہرہ ہے۔ اس کے پاس جو بال ہیں ـــ وہ مصنوعی بال ہیں ـــ یہ ہے تمہاری سینتا نرس۔"

میں آگے سننا نہیں چاہتا تھا۔ میں دوڑتا ہوا سینتا کے پاس گیا۔ میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر اس بات میں کیا حقیقت ہے ـــ یا یہ سب کسی گھڑت کہانی ہے ـــ یا ـــ لوگ ہماری خوشی کو دیکھ کر رشک سے جل اٹھے ـــ اب ایسی افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ سینتا نے مجھے دیکھ کر کہا

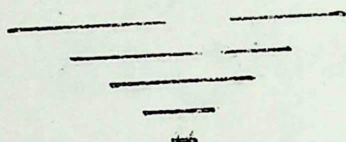
"اتنی رات گئے کیسے آئے؟"

"یہ پوچھنے آیا ہوں جو تمہارا چہرہ ہے وہ اصلی چہرہ ہے یا نقلی تمہارے پاس اپنا بھی کچھ ہے یا سب کچھ آج کی سائنس کی دی ہوئی چیزیں ہیں۔"

وہ بُت بنکر کھڑی رہی۔ میری بات کا اس کے پاس کوئی

جواب نہ تھا۔ سیتا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے کہا:

"رام ـــــ میرے پاس دل ہے۔ جو میرا اپنا ہے۔"



قربان گاہ

نہ صبح تو اپنی ہواؤں میں خوش آہنگ اور زندگی کا نیا ساز لئے ہوئے آئی۔ انسان نے موت پر فتح پائی۔ زندگی کا دامن چھوڑنے والا پھر ایک بار انسانی جامے میں آگیا۔ میری والدہ محترمہ کو COMMON BILE DUCT کے ایک خطرناک آپریشن سے دوچار ہونا پڑا۔ خطرہ بھی ٹل گیا اور زندگی میں سکون بھی آگیا۔ سب ہی خوش تھے اور میں بھی خوش تھا۔ لیکن میرے چاچا اس انسانی زندگی کے بدلے ایک قربانی دینا چاہتے تھے۔ اسلئے ایک صبح انہوں نے مجھے کہا:

"سعید جامع مسجد جاؤ۔ وہاں دو بکرے خرید لو۔ ذبح کرا دو اور گوشت کو غریبوں میں تقسیم کر دو۔"

بزرگ کا حکم تھا اور حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے میں ایک

ادیب ہوں جو اپنے پاس ایک حساس دل رکھتا ہے۔ ایک ایسا دل جس کے لئے ایک معمولی چوٹ بھی ایک اٹم بم سے کم نہیں ہوتی ہے۔

میں حکم کی تعمیل کرنے چلا وہی جانی پہچانی گلیاں اور وہی بُرے بھلے چہرے۔ ان سب سے تو میں پہلے ہی واقف ہوں۔ لیکن یہ سب کیوں مجھے اس دن اجنبی لگتے تھے ——— نہ جانے کیوں ——— بکرا خریدنے جانا تھا۔ مجھے وہی لمبی سیاہ داڑھی، خوفناک آنکھیں موٹا اور قد دراز لونگی اور لمبا کرتہ۔ اس کے زیب تن تھا۔ وہ بکرے فروخت کرنے والا تھا۔ میں نے ایک بکرے پر ہاتھ رکھکر کہا:

"سو روپیہ"

"ڈیڑھ سو"

"اتنے اونچے دام کیوں لگاتے ہو۔"

"اونچے دام لگانے پر گاہک ہی مجبور کر رہے ہیں۔"

جو دیا سو لے لو۔" میں نے کہا۔ "مجھے ان حیوانوں کو خریدنے میں کھینچا تانی پسند نہیں۔"

"بابو آپ کو حیوانوں کو خریدنے میں کھینچا تانی پسند نہیں ہے۔ لیکن یہاں تو انسانوں کو خریدنے اور فروخت کرنے میں کھینچا تانی کی جاتی ہے۔ سوا سو روپیہ دیجئے اور لیجئے اس بکرے کو۔"

سو کا نوٹ، دس کے دو، پانچ کا ایک ——— اور کل چار کاغذ کے ٹکڑے اس کے عوض میں ایک روح ——— ایک معصوم

حیوان اور اس کا سب کچھ مل رہا تھا اور وہ چار کاغذ کے ٹکڑے بھی تو اُس کو نہیں مل رہے تھے۔ یہ انسان بھی کتنا بڑا ظالم ٹھیکیدار ہے۔ طاقت کے بل بوتے پر حیوانوں پر راج کر رہا ہے۔ یہی معصوم بکرا اب جا رہا تھا قربان گاہ۔ ایسے لگتا تھا جیسے سارا جہاں اُس کے ساتھ قربان گاہ چلے آئے گا۔ جیسے سارا جہاں اُس کے ساتھ قربان گاہ میں جا رہا تھا۔ قصائی نے بکرے کو پرکھا۔

پورے پانچ لوں گا" پانچ کے لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے اس نے کہا" ورنہ مجھے اس کی کھال دے دیجئے۔"

"کھال لے لو۔"

میں نے مرتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ جیسے یہ سب سودا کرتے ہوئے مجھے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ لیکن یہ تو خوشی کی قربانی ہے۔ ایک زندگی پائی۔ اُس کے عوض ایک زندگی تو دینی ہی ہے۔ ابھی قربان گاہ کے پرنالوں سے سرخ خون بہنے لگا۔ ابھی جامع مسجد کے بڑے مینار سے اذان بلند ہو گی۔ ابھی تو کلیسا میں گھنٹیاں بجنی شروع ہو جائیں گی یہ سب تو ابھی ہو گا۔ مینار کی اذان ــــ مندر کی گھنٹوں سے۔

ایک ہی آواز آ رہی ہے۔

قربانی ــــ قربانی ــــ قربانی ــــ

خدا کو قربان چاہیئے کس لیئے ——— کیوں ——— لیکن میں نے دیکھا کہ خدا ایک پیسے میں بکتا ہے ——— ایمان بکتا ہے ——— جان بکتی ہے ۔ دو پیسے میں رام بکتا ہے ——— وہ دیکھو بچہ دوڑ رہا ہے ۔ ایک ہاتھ میں رام ہے اور دوسرے ہاتھ میں سیتا پھر وہی بکرے فروخت کرنے والا لمبا دراز قد رام ٹوٹ گیا ——— سیتا چکنا چور ہوئی ۔ بچہ رو رہا تھا ——— اُس کے رام اور سیتا زمین پر ٹوٹے ہوئے تھے ۔ میں نے بچے کو اٹھایا ۔

"نیا رام چاہیئے نئی سیتا چاہیئے ۔"

"نہیں" بچے نے روتے ہوئے کہا ۔ مجھے اپنا رام اور اپنی سیتا چاہیئے ۔" بکرا بھی معصوم نگاہوں سے کہہ رہا تھا ۔

"نہیں مجھے بھی نئی زندگی نہیں چاہیئے ۔ مجھے میری اپنی ہی زندگی چاہیئے" لیکن قصائی اُس بے بس جانور کو بے دردی سے کھینچے جا رہا تھا ۔ وہ مجھ سے التجا کر رہا تھا کہ نہیں میں نہیں جاؤں گا اُس قربان گاہ میں ———

وہاں تیز لیکن لمبی چھری صاف شفاف تھی ——— ایک نہیں ——— دو نہیں ——— درجنوں تھیں ——— اُن کو دیکھ کر بکرے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ میرا بھی دل چھلنی ہوا ——— لیکن ——— لیکن میں کیا کر سکتا تھا ۔ اُس کو تو قربانی پر چڑھ جانا تھا ۔ اُس کے گوشت و پوست جسم سے اُس کی ریشم جیسی کھال الگ ———

کی جائے ــــ وہ دیکھو ــــ وہ قصائی اپنی چھری سے اُس کا گلا کاٹ رہا ہے۔ قصائی اپنی چھری ــــ اُف ــــ یہ انسان کہاں سے یہاں آگیا ــــ وہ قصائی کس بے دردی سے اُس انسان کے جسم سے کھیل رہا ہے۔ نہیں میں ایسا پتھر دل نہیں ہوں۔

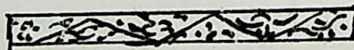
وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگ مجھے حیرت زدہ آنکھوں سے تکنے لگے۔ قصائی نے مجھ سے کہا:

"کیا ہوا بابو؟"

"کچھ نہیں۔"

میں نے جواب دیا۔ میں نے ہوش سنبھالا۔ ابھی تک قصائی نے چھری نہ اٹھائی تھی لیکن میرے ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی قصائی کے اوسان بگڑ گئے۔ بکرا اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ بھاگ رہا تھا میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرا چہرہ اب ہشاش بشاش نظر آنے لگا۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے قصائی کے بیٹے نے کہا:

"جائے گا کہاں حرامی ــــ آخر دم توڑنے کے لئے اُس کو قربان گاہ آنا ہی ہوگا۔"



سرخ چادر

بچپن سے مختلف رنگوں کا انسانی ذہن مختلف اثر لیتا ہے کسی کو سبز رنگ زیادہ پسند ہے اور کسی کو سرخ رنگ اور کسی کو ان دونوں رنگوں سے اسقدر نفرت ہوتی ہے کہ وہ ان دونوں رنگوں کو اپنے پاس کھٹکنے تک نہیں دیتا ہے۔ پھر بھی عام انسان رنگوں کے بارے میں غیر معمولی حد تک سنجیدہ نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن سدھیر رنگوں کے بارے میں غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھا۔ یوں تو وہ تیس سال کا نوجوان تھا جس نے تھوڑے سے عرصے میں اپنے انوکھے کاروبار سے دو تین لاکھ روپے بنائے تھے۔ اس کمائی سے اب [illegible] مکان بنا رہا تھا۔ اس وقت اس کے کرائے کے مکان میں سیٹھ کرتار سنگھ موجود ہے۔ سیٹھ شہر کے مشہور و معروف مکان بنانے کے ٹھیکیدار ہیں۔

سدھیر نے کہا:

"ہاں تو سیٹھ صاحب میرے اس نئے بنگلے میں جے پور کے سُرخ پتھر لگ جائیں گے۔" ٹھیکیدار نے کہا:

"لیکن حضور اینٹ کیوں نہیں لگا دیتے۔ ایک تو اس سے قیمت میں بھی کمی ہوگی اور پھر اس کے علاوہ جدید مکانات بھی اینٹوں سے ہی زیادہ تر بنتے ہیں۔" سدھیر نے کہا:

"لیکن مجھے صرف سرخ رنگ پسند ہے۔ وہ بھی کونسا سرخ رنگ جو جے پور کے پتھروں میں ہوتا ہے۔ یہاں رنگ میں آج ہی کہہ دیتا ہوں کہ اندر کے دیواروں کا رنگ بھی سرخ ہونا چاہیئے۔ فرش پر جو سیمنٹ لگایا جائے اس کا رنگ بھی سرخ ہونا چاہیئے۔"

ٹھیکیدار نے ہتھیار چھوڑتے ہوئے کہا:

"یہ تو مرضی ہے آپ کی ویسے اس بنگلے کا نام بھی سرخ بنگلہ ہی آپ کو رکھنا چاہیئے۔"

"وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ـــــ بن جائے گا" ٹھیکیدار نے کہا: "ویسے بھگوان سے میری یہی دعا ہے کہ اس نئے مکان میں داخل ہوتے ہی آپ کی شادی ہو جائے۔"

"دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟"

"ابھی کوئی نظر میں نہیں ہے۔"

نہیں بھیا ـــــ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"اچھا ہم دعا کرینگے کہ جلد ہی ایسا موقعہ آ جائے۔" ٹھیکیدار نے ہنستے ہوئے کہا!

تھوڑے ہی دنوں میں سدھیر کا نیا مکان بننا شروع ہوا اس نئے مکان کے بنتے ہوئے وہ صرف سرخ رنگ ذہن میں رکھتا تھا۔ یہاں تک باغ بننے سے پہلے ہی اس نے سرخ رنگ کے بیج ڈھونڈ نکال لئے۔ بڑے شوق اور ارمانوں سے اس مکان کو بنا رہا تھا۔

ایک دن مکان کی طرف سدھیر موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ بیس سال کی ایک لڑکی اس کے موٹر سائیکل کے نیچے آنے سے بال بال بچ گئی۔ سدھیر نے موٹر سائیکل کھڑی کی لڑکی زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہاں وہی ـــــ وہی لڑکی جس کی وہ تلاش کر رہا تھا سرخ ساڑھی میں ملبوس ـــ سرخ رنگ اس کے گالوں پر چھایا ہوا اور اس کے دلکش چہرے کو سرخ رنگ کے ہونٹوں نے چار چاند لگائے تھے۔ وہ اس کو صرف دیکھے جا رہا تھا۔

"اندھے ہو کیا؟ ـــــ دیکھ کے نہیں چلتے ہو۔"

"اندھے تو ہو ہی" لڑکی نے کہا۔ "لیکن اب بہرے بھی نکلے۔"

سدھیر سنبھل گیا۔ اس نے کہا

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن آپ سرخ ساڑھی میں بہت حسین لگ رہی ہیں۔"

"او ـــ شٹ اپ!"
سدھیر نے ہنستے ہوئے کہا:
"اس بات میں کچھ حقیقت ہے کہ آجکل کی حسین لڑکیاں پیار کا
آغاز شٹ اپ سے کر رہی ہیں۔"
"او ـــ تم تو پرلے درجے کے لوفر بھی لگتے ہو۔"
"یہ تو پیار کی سیڑھی کا دوسرا زینہ ہے۔"
لڑکی چیخ پڑی
"تم لفنگے ـ لوفر اور نہ جانے کیا ہو۔"
"اجی پھر تو پیار ہو ہی گیا۔"
اس چھیڑ چھاڑ نے رنگ لایا۔ لڑکی کا نام بملا تھا۔ ایک دن سدھیر
نے بملا سے کہا:
"بملا اب بہت جلد میرا اپنا مکان تیار ہو رہا ہے۔ جانتی ہو وہاں
جا کر میں پہلا کام کیا کروں گا۔"
"کیا؟"
"تم سے شادی۔"
بملا شرما کر بھاگ گئی اور پھر اس بھاگ دوڑ میں وقت بھی بھاگنے
لگا۔ پھر وہ وقت بھی جلد آیا۔ جب سدھیر کا نیا مکان بالکل تیار ہوا۔
سدھیر کی والدہ کے علاوہ اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ جس دن سدھیر
نے مکان میں داخل ہوا۔ اس دن والدہ کے علاوہ، بملا بھی اس کے

ساتھ تھی۔ کنٹریکیٹر نے کہا:

"سدھیر بابو آپ کو نیا مکان مبارک ہو۔"

"شکریہ"

پھر پنڈت جی کے کچھ مذہبی رسومات کے بعد بملا سدھیر اور سدھیر کی ماں نئے مکان میں داخل ہوئے۔ سدھیر نے بملا سے کہا:

"آؤ بملا میں تمہیں مکان دکھاتا ہوں۔"

سدھیر کی ماں نے کہا:

"ہاں —— ہاں —— جاؤ بیٹی۔"

سدھیر نے ایک کمرے کو دکھاتے ہوئے بملا سے کہا

"بملا یہ ہوگا ہماری لائبریری کا کمرہ۔"

دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا:

"یہ دیکھو —— اس کمرے میں کبھی کبھار بیٹھ کر ہم تاش کرم بورڈ کھیلا کرینگے۔"

بملا سرخ ساڑھی میں آسمان کی حور لگ رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا:

"ہاں بملا یہ ہوگا ہمارا بیڈ روم"

بملا شرما گئی —— سدھیر نے کہا:

"آؤ —— یہ دیکھو —— بیڈ —— ہاں —— بیڈ۔"

بملا سدھیر کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ بیڈ پر سرخ رنگ کی

چادر بچھی ہوئی تھی اور نرملا سرخ رنگ کی ساڑھی میں تھی ـــــ سرخ رنگ کی ساڑھی ـــــ سرخ رنگ کی چادر ـــــ سرخ ـــ سرخ

سدھیر کے اوسان خطا ہونے لگے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا اب دماغ پھٹا ـــــ اب پھٹا

وہ چیخ پڑا۔

"نرملا"

پھر اس کے ہاتھوں میں نرملا کی گردن تھی۔ نرملا کی گردن اس کے ہاتھوں سے آزاد ہونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سدھیر کہہ رہا تھا۔

"نرملا ـــــ تم بے وفا ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا"، سدھیر کی ماں دوڑتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ وہ چیخ پڑی۔

"سدھیر"

اس نے بڑی مشکل کے بعد نرملا کو سدھیر کے ہاتھوں سے نکال دیا۔ ماں نے کہا؛

"پاگل ہو گئے ہو۔"

"نرملا ـــــ نرملا" سدھیر صرف یہی نام پکارے جا رہا تھا اور کسی چیز کا اس کو ہوش نہ رہا تھا۔ ماں کہہ رہی تھی۔

"اف بھگوان ـــــ ایسا ہوا ـــــ نا ـــــ آخر۔"

سدھیر بے ہوش ہو کر بیڈ پر گر گیا۔ نرملا ہوش میں آگئی سدھیر

کی ماں نے بملا سے کہا:

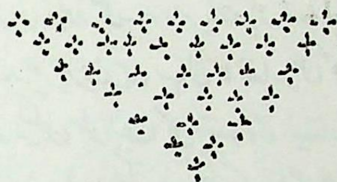
"بیٹی اب تم سے کیا چھپاؤں۔"

"کیا بات ہے ماں جی!" بملا نے اپنی آواز کو سنبھالتے ہوئے کہا: "یہ سب سدھیر کو اچانک کیا ہوا۔"

"سب کہوں گی" بوڑھیا نے دم لیتے ہوئے کہا: "بہت دنوں کی بات ہے جب سدھیر صرف تین سال کا تھا۔ اس کا باپ ایک طوائف سے محبت کر بیٹھے۔ لیکن طوائف کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ ایک سے سو کمانا اور دوسرے سے دو سو۔ لیکن سدھیر کے پتا جی یہی سمجھ رہے تھے کہ طوائف سے سچا پیار ہے۔ لیکن ایک دن جب اُن کے ساتھ سدھیر تھا یہ راز کھل گیا کہ طوائف کا پیار صرف دولت کے ساتھ تھا۔ سدھیر کے پتا کو بہت غصہ آگیا۔ اس نے کہا — "نرملا — نرملا۔ تم بے وفا ہو۔" نرملا اس وقت سرخ چادر پر آرام فرما تھی۔ غصے میں سدھیر کے پتا نے پھل کاٹنے کا چھرا نرملا کے سینے میں گھونپ دیا۔ سدھیر اس حادثے کو دیکھ کے بے ہوش ہوا۔ ہوش میں آنے کے بعد اُس کی پر یہ حملہ تھا۔ "نرملا تم بے وفا ہو"۔ ڈاکٹر کے علاج نے سدھیر کو ٹھیک کردیا۔ لیکن ڈاکٹر نے یہ بھی ہدایت دی کہ سدھیر کے سامنے کبھی سرخ چادر نہ رکھنا۔ ورنہ اس کو دوبارہ دورہ پڑھ سکتا ہے۔"

اب سدھیر کی ماں خاموش تھی۔ بملا خاموش تھی اور سدھیر کے چہرے پر اطمینان کی نیند رہتی۔ سدھیر کی ماں نے بملا سے کہا:

"بھلا تم ہی میرے بیٹے کو سنبھال سکتی ہو۔"
بھلا فیصلہ نہ کر پاتی تھی اُسے کیا کرنا چاہیے ؟



بھنگی

بھنگی کا لفظ جب زبان پر آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہونٹوں تک ایک بہت بڑی گالی چلی آئی ہے۔ اگر میں نے اردو زبان کی لغات کو مرتب کیا ہوتا تو میں اس لفظ کو کبھی لغات میں شامل نہیں کرتا۔ لفظ کبھی برے نہیں ہوتے ہیں۔ دراصل یہ انسانی ذہن ہے جو لفظوں کو برا بناتا ہے۔ اور ان کو وہ ایک ایسے ماحول کے سپرد کر دیتا ہے جہاں لفظوں کی اصلیت پر گندا لحاف چڑھ جاتا ہے۔ جب بھی میں لال چوک کی سڑک پر تانگے پر سوار گھر کی طرف جاتا ہوں۔ تب میں کسی نہ کسی بھنگی کو سڑک صاف کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ایسے لمحات پر اکثر آدمیوں کے منہ لٹک سا جاتے ہیں۔ تب میرا دل جیسے چیخنے لگتا ہے میں اپنے آپ سے کہتا ہوں۔

"اٹھو اور لفظوں کا گندہ لحاف اتار پھینک دو۔"

لیکن میرا یہ جذبہ تھوڑی دیر کے بعد ہی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ اور میں ایک بار پھر گھوڑے کی رفتار میں کھو جاتا ہوں۔ میں غور سے گھوڑے کی رفتار کو دیکھتا ہوں آہستہ آہستہ اس کی اس رفتار میں ایک چہرہ نمودار ہوتا ہے ــــ جانا پہچانا چہرہ ــــ ہاں ایک بھنگی کا چہرہ۔

وہ شروع سے آخر تک بھنگی تھا۔ نام اُس کا تھا۔ صمد ــــ نہیں ــــ صمد بھنگی ــ صمد بھنگی سے سرینگر کے گلی کوچے واقف تھے۔ سرینگر شہر کے ہر کوچے۔ ہر سڑک کی اس نے گندگی اٹھائی تھی۔ ایک وقت تک گندے اور صاف کوچے اور گلیاں صمد کو نہیں بھول سکتے ہیں۔ کون ایسا آدمی تھا جو صمد کو نہیں جانتا تھا۔ اس کا پتہ ہی ایسا تھا۔ جہاں ہر ایک کو اس کے ساتھ جان پہچان ہونی ضروری تھی۔ تھا وہ ایسا کوئی پاخانہ جس نے صمد کا جاڑو نہ دیکھا تھا۔ یوں تو وہ ایک بھنگی تھا لیکن وہ شرافت کا ایک پیکر مجسم تھا...... وہ انسان تھا ــــ لیکن ــــ وہ ایک بھنگی تھا۔ اسلئے کبھی کسی نے اس کے انسان ہونے کا ذکر نہیں کیا۔

ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی خواہش ہوتی ہے۔ وہ بھنگی ہی کیوں نہ ہو۔ صمد کی یہ خواہش تھی۔ کہ اس کے گھر ایک اولاد پیدا ہو۔ اس نے خانقاہوں کی کھڑکیوں پر کپڑے کے تنکے لٹکائے۔ لیکن اس کی یہ خواہش پھر نہ آئی۔ وہ قدرت سے مایوس ہوا تھا۔ اس لئے اب صمد بھنگی اداس رہتا تھا۔

پھر ایک دن مجھے غیر معمولی طور پر خوش نظر آیا ۔ میں نے اُس دن صمد سے کہا :

"کیوں صمد آج کیا بات ہے کہ تم خوشی سے پھولے نہ سما رہے ہو۔"

صمد بھنگی نے جواب دیا ۔

"حضور مجھ پر خدا مہربان ہوا ۔ میرے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا ۔ میں حضور باپ بن گیا ہوں ۔"

میں نے صمد بھنگی کے مسرت سے بھرپور چہرے کو دیکھا ۔ پھر سنجیدہ آواز میں کہا : "صمد کیا اس کو بھی بھنگی بناؤ گے ۔"

صمد زمین پر بیٹھ گیا اور کہا :

"نہیں ! بابو وہ بھنگی نہیں بنے گا ۔ وہ آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بن جائے گا ۔ ہاں بابو میں اس کو خوب پڑھاؤں گا ۔ وہ بہت بڑا آدمی بن جائے گا ۔"

مجھے خوشی ہوئی کہ آج ایک بھنگی کچھ اور بول رہا تھا ۔ وہ بھنگی جس کو سماج صرف اندھیرے غاروں میں دھکیل دینا جانتا ہے ۔

پھر وقت کا دھارا بہتا رہا اور چھ سال یوں چلے گئے ۔ جیسے کبھی نہ آئے تھے ۔ پھر میں اپنے بیٹے کو اسی محلے کے ایک سکول میں داخل کرانے گیا ۔ جہاں صمد کا بیٹا پڑھ رہا تھا ۔ میں نے سکول کے ایک استاد سے پوچھا

"صمد کا لڑکا کس جماعت میں پڑھ رہا ہے ۔"

"کس صمد کا لڑکا ہے ۔"

"صمار بھنگی کا لڑکا۔"

حضور بھنگی کا لڑکا صرف بھنگی ہی بن سکتا ہے۔ ایک سال پڑھا اور چھوڑ دیا۔"

استاد سے یہ بات سن کر مجھے دلی صدمہ ہوا کیونکہ مجھے محسوس ہوا بھنگی کا لڑکا مر گیا تھا۔

پھر بہت مدت بعد مجھے صمار بھنگی ملا۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا اس کے ہاتھ میں وہی پرانا جھاڑو تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"صمار تمہارا لڑکا زندہ ہے؟"

"زندہ ضرور ہے۔ لیکن بابو میں اس کو وہ نہیں بنا سکا۔ جو میں نے اس کو بنانا چاہا۔"

مجھے صمار سے ہمدردی ہو گئی جس کی کشتی کو ایکبار پھر بادمخالف نے الٹ کے رکھ دیا تھا۔ پھر میں نے ایک دن صمار اور اس کے چھوٹے بیٹے کو سڑک صاف کرتے ہوئے دیکھا۔ میں چاہتا تھا کہ صمار کے بوڑھے بازوؤں میں ایکبار پھر وہ قوت بھر دوں جو اس کو سماج سے بغاوت کرنا سکھا دے۔

وقت کیا سلوک کس کے ساتھ کرتا ہے کسی کو یہ سب جاننے کے لئے فرصت نہیں ہوتی ہے۔ بس سب ہی اپنی دھن میں کھوئے رہتے ہیں۔ صمار اور اس کا چھوٹا بیٹا سڑکوں کو صاف کرتا رہا۔ موٹر بسیں۔ تانگے سبھی کچھ سڑکوں پر چلتے رہے اور کس کے ساتھ

باپ بیٹے کا جھاڑو بھی سڑکوں پہ چلتا رہا۔

پھر ——— پھر ایک دن ——— صمد کا چھوٹا بیٹا لال چوک کی سڑک صاف کرتے ہوئے ایک موٹر کی زد میں آگیا۔ معصوم بچے کا خون سڑک پہ پھیل گیا۔ صمد بت کی طرح کھڑا رہا وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"میں اس کو وہ نہ بنا سکا جو وہ بن جانا چاہتا تھا اس لیے خدا نے اس کو واپس بلا لیا۔"

دوسرے دن میں نے صمد بھنگی کو سڑک پر اپنے ہی بیٹے کے خون کے دھبوں کو صاف کرتے ہوئے دیکھا ——— کیونکہ ——— وہ ——— بھنگی تھا۔ ⁂ ⁂ ⁂

ICN

احساس کا گھاؤ

نواب بہادر جنگ کے خاندان کو لکھنؤ میں کون نہیں جانتا تھا وہ زمانہ نہ رہا۔ جب لکھنؤ میں نوابوں کے عیش و عشرت کے نقارے بج رہے تھے۔ اب تو وہ نواب خاندان صرف نام کے رہ گئے تھے۔ اور اِن چند گنے چُنے نوابوں کے پاس نہ اقتدار رہا اور نہ ہی دولت۔ لیکن اب بھی وقت کے ستائے ہوئے ان نوابوں کے پاس ایک چیز تھی ——— وہ تھی ——— نواب کی ناک! ان نوابوں کے پاس لفظِ ناک کے معنی یہ ہے کہ بات بات غصہ کر کے اپنی برتری جتانا ———

نواب عظمت اللہ تیس سال کا نوجوان تھا۔ سنگدل۔ بات بات پر جھگڑا کرتا تھا۔ حال ہی میں لکھنؤ میں مصرا بائی آگئی تھی۔

نواب صاحب مصرا بائی کو دیکھ کر دل دے بیٹھے چاہتے تھے کہ مصرا بائی بھی خاندان کی قدیم حویلی میں قیام پذیر ہو۔ لیکن اب تو اس

کے پاس صرف حویلی تھی۔ وہ تین یا اس سے زیادہ عورتیں رکھنے کیلئے رقم نہ تھی۔ اس لئے مصرا بائی حویلی میں نہ آسکی۔ ہاں البتہ نواب نے اپنے خاندان کی قدیم روایت کو اپنایا۔ اور اس نے مصرا بائی کو اپنی داشتہ بنایا۔

مصرا بائی حویلی میں نہ آئی اسلئے نواب صاحب اس کی باہر کی زندگی سے غافل رہے۔ پھر تو مہنگائی کے اس زمانے میں صرف چند سو روپیوں کو اپنا سہارا بنانا کہاں کی عقل تھی۔ اسلئے مصرا بائی کو اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے پڑے۔

مشہور کاروباری حیدر بخشی کی محفل کی زینت مصرا بائی بن گئی تھی۔ اچانک ہر تھالی کا بیگن سلطان میاں اس محفل میں آپہنچا۔ سلطان میاں کا پیشہ تھا کہ وہ ایک جگہ کی خبر دوسری جگہ اور دوسری جگہ کی خبر تیسری جگہ لے جائے۔

وہ نواب عظمت اللہ کے پاس دوڑتے ہوئے آیا اور نواب سے کہنے لگا۔

"نواب صاحب مصرا بائی نے کب سے آپ کا در چھوڑ دیا۔"

"کیا مطلب؟"

نواب عظمت اللہ چیخ پڑا۔ سلطان میاں نے نواب کی ایسی چیخ کبھی نہ سنی تھی۔ وہ گھبرا اٹھا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"حضور نواب صاحب مصرا بائی کل حیدر بخش کی محفل میں ناچ رہی تھی۔"

نواب نے خوفناک آواز میں کہا۔

"نواب سے دغابازی ——— مصرا بائی۔ یہ تو نے اپنے حق میں اچھا نہ کیا۔"

نواب نے اپنا خاندانی بندوق اٹھایا۔ سلطان میاں دوڑتے ہوئے نواب کے قدموں سے لپٹ گیا۔ اُس نے نواب سے روتے ہوئے کہا۔

"نواب صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔؟"

لیکن نواب عظمت اللہ کا دل پتھر کا بن گیا تھا۔ اس نے سلطان میاں کو لات ماری اور اپنی موٹر گاڑی میں سوار ہوا۔ اب تو یہی ایک کار نواب کے پاس تھی۔ جو وہ خود چلا رہا تھا۔ پرانی ماپ کی اس موٹر کار پر نواب کو فخر تھا۔ کیونکہ وہ نواب کے دادا کی نشانی تھی۔

اچانک کار چلاتے ہوئے نواب نے محسوس کیا کہ کار کی بریک فیل ہو گئی ہے۔ وہ بدحواس ہو گیا اور اس بدحواسی میں اس کی موٹر کار آتی ہوئی ٹرک سے ٹکرا گئی۔ نواب خون میں لت پت ہو گیا اردگرد کے کچھ لوگوں نے نواب کو ایک ٹیکسی میں بٹھا کر ہسپتال پہنچایا۔

"زندگی چاہیے تجھے" ڈاکٹر نے مریض کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن زندگی کو حاصل کرنے کے لئے کبھی کبھی زندگی کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے۔" مریض کے چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی مسکراہٹ میں درد و کرب چھپا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"ڈاکٹر میں ایک ادیب ہوں جس کی حساس زندگی میں ہر چھوٹا حادثہ موت کے برابر ہوتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے حادثے ہمارے دل پر ایسا اثر کر کے چھوڑ جاتے ہیں۔ کہ ہمارے دل میں لاتعداد زخم پڑ جاتے ہیں۔ ہم لوگ یا تو تپ دق کے مریض بن جاتے ہیں۔ یا دل کے مریض بنکر ہمیشہ کے لئے زندگی کو خیرباد کرتے ہیں۔ اب دیکھئے ——— نا تیسری بار میرے دل پر دورہ پڑا ہے۔ اب موت یقینی ہے۔ میں خوش ہوں کہ میں اس زندگی سے چھٹکارا پا رہا ہوں۔" اب ڈاکٹر نے مریض سے کہا:

"مسٹر ہمارانی تم ایک قابل ادیب ہو۔ ملک کو تمہاری نگارشات پر فخر ہے۔ اور ملک کو تم جیسے قابل فنکاروں کی ضرورت ہے۔ اور اس سائنسی دور میں ہم آپ جیسے قابل فنکار کو اس آسانی کے ساتھ کھونے والے نہیں ہیں۔"

ہمارانی نے ڈاکٹر سے کہا:

"ڈاکٹر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے اپنے سفید گون کی جیب سے بائیاں ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔

"چند منٹ پہلے ایک مریض کی موت ہوتی ہے۔ اس کا دل۔ جو ہے وہ اب بھی صحیح سلامت ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو تمہارا دل بدلا جا سکتا ہے۔"

ہمدانی نے کہا۔

"ڈاکٹر میری زندگی جو اب بھی ایک لاش سے بدتر ہے ہو سکتا ہے سائنس کا یہ کرشمہ اس تلاش میں پھر سے زندگی دوڑا سکے.... ڈاکٹر مجھے منظور ہے یہ اپریشن کروانا۔"

ڈاکٹر نے مسرت بھری آواز میں کہا۔

"مجھے تمہارا یہ فیصلہ سن کے بہت خوشی ہوئی۔ شاباش میرے بچے.... شاباش۔"

بوڑھا ڈاکٹر کھڑا ہو گیا۔ اب تو اس کو ضائع کرنے کے لئے وقت ہی نہ تھا۔

چھ گھنٹے تک آپریشن ہال کے دروازے بند رہے۔ ایک انسان کا دل بدلا جا رہا تھا۔ کوئی مذاق کی بات نہیں تھی دل.... جو احساسات کا مرکز ہوتا ہے جو انسانی جسم میں سب سے اہم مقام رکھتا ہے۔

چھ گھنٹے کے بعد ہمدانی کو آپریشن ہال سے باہر لایا گیا۔ بوڑھے ڈاکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو اعلان کر رہی تھی کہ اس نے موت پر فتح پائی ہے۔ ایک بار پھر وہ ایک انسان کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہوا۔

بیس دن تک عالم مافیہا سے بے خبر ہمدانی ہسپتال کے بستر پر پڑا رہا۔ پہلی بار جب اس نے آنکھیں کھولیں تو

نے بوڑھے ڈاکٹر کو اپنے آپ پر جھکا ہوا پایا۔ ہمدانی نے کہا۔
"میں زندہ ہوں ڈاکٹر؟"
"yes my lad"
ایک ماہ کے بعد ہمدانی تندرست ہو کر ہسپتال کی دنیا کو خیرباد کہہ کے اپنے گھر واپس آیا۔ گھر کا نوکر اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ہمدانی اپنی لائبریری میں چلا گیا۔ وہ کسی اچھی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ چھ ماہ سے اس نے کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن آج اُس کو لائبریری ایک قید خانہ لگتا تھا۔ اس قید خانے کی ہر کتاب اس کو ایک ایک جلاد لگتا تھا۔ وہ کوئی کتاب نہیں پڑھ پاتا تھا۔ ہمدانی بے چین تھا۔

اس کی آواز بھی قدرے بھاری ہو گئی تھی۔ اس کی آواز میں پہلی سی لچک نہیں رہی تھی۔ اس میں کھردرے پن کے ساتھ سنجیدگی بھی چھا گئی تھی۔ اچانک اس کا دل کسی کی چاہ میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بے اختیار ہو کر اس کے لبوں پر ایک نام آگیا۔

"مصرا........ مصرا........ مصرا بائی تم میرے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی ہو۔ تم بے وفا نہیں ہو سکتی ہو ـــــ ہاں تم بے وفا نہیں ہو سکتی ہو۔"

ہمدانی کی چیخیں سن کر نوکر دوڑتا ہوا لائبریری میں آگیا اس کے احساسات جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا مالک ــــــ کیا ہوا؟"

ہمدانی کو کچھ یاد آیا۔ اس نے دل کی آواز پر قابو پالیا۔ اور کہا۔

"کچھ نہیں ــــ کھانا لگاؤ۔"

نوکر حیرانی سے مالک کو تکنے لگا۔ اور اُس نے کہا۔

"مالک، آپ کو کیا ہوا ہے...... آپ کی آواز کو کیا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب،"

ہمدانی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے نوکر سے کہا۔

"جاؤ....... جاؤ تم کھانا لگاؤ۔"

کھانا کھانے کے بعد اس کے دل کو کسی چیز کی پیاس محسوس ہوئی۔ وہ کچھ اور چاہتا تھا...... وہ چیخ پڑا۔

"دین محمد، جا کر بازار سے وسکی لاؤ۔ بہت دنوں سے میں نے وسکی نہیں پی لی ہے۔" نوکر حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اس نے کہا:

"مالک، آپ نے زندگی بھر وسکی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پھر یہ آج آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

ہمدانی دل کی پیاس کے ہاتھوں غلام ہو گیا تھا۔ اس نے نوکر سے کہا۔

"دین محمد میں نے جو کہا۔ اس پر جلدی عمل کرو۔"

نوکر تو بہر حال حکم کی تعمیل کرتا ہی ہے۔ اس نے وسکی کی بوتل

لائی۔ اس رات ہمدانی نے خوب وسکی پی لی۔

صبح ہو گئی۔ ہمدانی کا ذہن پھر ایک بار ہوشیار ہو گیا۔ وہ پھر سوچنے لگا اور خود سے کہنے لگا۔

"آخر مجھے ہوا کیا ہے۔"

وہ اس معمہ کو حل نہ کر پاتا تھا۔ شاید آپریشن کے بعد کمزوری کے سبب یا یہ کچھ ہو رہا تھا۔

اس کے دوست اس سے ملنے آئے۔ ان کو اس کے نئے اور عجیب رویہ پر حیرت ہوئی۔ وہ سب کہتے تھے۔ "ہمدانی آپریشن کے بعد تم بہت بدل گئے ہو۔"

دوستوں نے دنیا کے حادثوں کا تذکرہ چھیڑا لیکن وہ سب تذکرے اس کو پھیکے لگے۔ کل تک یہی تذکرے اس کی کہانیوں کی جان تھی دوستوں کے جانے کے بعد ایک بار اس نے قلم ہاتھ میں اٹھایا۔ رحمان نے ہمدانی کے سامنے زندگی کا دردناک پہلو رکھا تھا۔ ہمدانی کا ذہن کہہ رہا تھا کہ زندگی کے اس دردناک پہلو پر وہ ایک بہترین افسانہ لکھ سکتا ہے لیکن دل پر اس حادثے نے کوئی اثر نہ کیا تھا۔ وہاں کوئی تڑپ پیدا نہ ہوئی تھی۔ دل میں کوئی ایسی دھڑکن پیدا نہ ہوئی۔ جو اس کے قلم کو جنبش عطا کر سکتی وہ قلم ایک جگہ رک گیا۔ اور آگے چلنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ پھر جب آگے چلا تو اس کا ذہن دل کی الجھنوں میں الجھ گیا۔ اور آخر کار قلم کی نب ٹوٹ گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔

"کہاں۔ وہ میرا دل گیا ـــــــ اف کیا ہوا ہے مجھے۔"
دل کی ان حرکتوں نے اس کے ذہن کو کوفت دی اور ہمدانی ذہنی کوفت برداشت نہ کر پاتا تھا۔ اسلئے وہ دوڑتا ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنی ساری روداد ڈاکٹر کو سنا دی اور کہا:
"آخر یہ سب کیا ہے؟ ڈاکٹر میں کیوں بدل گیا۔ میرے احساسات کیوں بدل گئے۔"
"ہمدانی" ڈاکٹر نے سنجیدہ آواز میں کہا۔ "تمہارے سینے میں اب جو دل دھڑک رہا ہے۔ وہ نواب عظمت اللہ خان کا دل ہے۔"
ہمدانی چیخ پڑا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا:
"نہیں .... نہیں .... ڈاکٹر کہہ دو کہ میرے سینے میں اس سنگدل آدمی کا دل نہیں دھڑک رہا ہے۔"
ڈاکٹر خاموش رہا۔ ہمدانی چیخ پڑا۔
"ڈاکٹر مجھے یہ دل نہیں چاہئے۔ ڈاکٹر مجھے اپنا دل واپس دو ڈاکٹر میرا دل واپس لوٹا دو۔" ڈاکٹر نے صرف اس کے سر پر تسلی کا ہاتھ رکھا۔ ہمدانی مایوس گھر لوٹا۔ نئی زندگی نے اس کا سب کچھ چھین لیا۔ نئے دل نے اس کو ذہنی کوفتوں کے انبار اور کیا بخش دیا۔
گھر پہنچتے ہی ہمدانی نے حیدر بخش کا دعوت نامہ پایا وہ دعوت میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اکیلے بیٹھ کر دل کی الجھنوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ ہمدانی حیدر بخش کی رنگین محفل میں تھوڑی ہی دیر

کے لیے دل اور ذہن دونوں کو بھول گیا۔

لیکن اچانک محفل میں ایک جانی پہچانی صورت پائل کی چھم چھم کے ساتھ محفل میں آگئی۔ وہ مصرا بائی تھی۔ جوں ہی اس کے جسم نے تھرکنا شروع کیا توں ہی ہمدانی کا دل بے قابو ہو گیا ناچ جہاں عروج پر پہنچ گیا۔ وہاں ہمدانی کی دھڑکنیں بھی عروج پر جا پہنچ گئیں۔ وہ چیخ پڑا۔

"مصرا بائی ـــــ تم بے وفا نہیں ہو سکتی ہو ـــ مصرا ـــ تم نواب کو دغا دیکر غیروں کی مجلس میں نہیں ناچ سکتی ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ دوں گا۔"

ساری محفل میں خاموشی چھا گئی۔ ہمدانی پر وحشت چھا گئی اور اس وحشت نے ساری محفل پر وحشت طاری کر دی۔ ہمدانی مصرا بائی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انتقام سے اسکی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں غصے سے اس کا سارا چہرہ سرخ ہو گیا تھا جیسے سارا خون چہرے میں جمع ہو گیا ہے۔ اسکے ہاتھوں کی انگلیاں عجیب طریقے سے ایکدوسرے میں الجھی ہوئی تھی لیکن مصرا بائی تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کو کچھ ہوا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ڈاکٹر کے آنے تک وہ مر گیا تھا۔

دوسرے دن اخباروں میں یہ خبر سرخی کے ساتھ آئی۔

"دل کا تیسرا آپریشن۔ مریض صرف تین ماہ زندہ رہا۔"

[illegible]

یاد

فلم سٹوڈیو کے ساتھ جو چھوٹا اور واحد ریسٹورنٹ تھا وہ احمد خان کا تھا۔ احمد خان اس چھوٹے ریسٹورنٹ کا سب ہی کچھ تھا۔ بیرے سے لیکر مالک تک کے سب ہی فرائض وہ انجام دیتا تھا۔ یوں تو اس کے چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیس ٹوٹی ہوئی کرسیوں اور تین چار چیزوں کے علاوہ دس بیس چینی کے پیالے بھی تھے۔

اسسٹنٹ ہدایت کار سے نیچے جو بھی آدمی اس سٹوڈیو میں کام کرتا تھا۔ وہ ضرور اس ریسٹورنٹ میں دو چار چائے کے کپ ہفتے میں نوش کر لیتا۔

احمد خان کی زندگی بھی کیا تھی؟ اس نے بھی کبھی یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ فلمی دنیا کا ایک بہت بڑا اداکار بن جائے گا۔ لیکن یہ خواب ریسٹورنٹ میں تبدیل ہوا۔ جہاں فلمی دنیا کے چمچے ہر لمحے اس کے

ریسٹورنٹ میں موجود رہتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت بڑا اداکار نہ بن سکا۔ لیکن فلمی دنیا کے بڑے بڑے اداکاروں کے اسکینڈل ضرور اس کے ریسٹورنٹ میں جنم لیتے تھے۔

احمد خاں فلمی دنیا کے نت نئے اسکینڈلس کے سنس پڑتا تھا۔ یوں بھی وہ زندہ دل آدمی تھا۔ اکثر اشخاص جو اس شہر میں فلمی دنیا کے خواب دیکھتے ہوئے آجاتے تھے۔ وہ بالآخر احمد خاں کے پاس اپنا ٹھکانہ بنا لیتے تھے۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کا گھر کسی اونچے مکان میں بن جاتا تھا اور پھر وہ احمد خان اور احمد خان کے ریسٹورنٹ دونوں کو بھول جاتے تھے۔

احمد خان ایک صبح اپنی پرانی ٹوٹی ہوئی کرسیوں کو صاف کر رہا تھا۔ کہ ایک نوجوان نے اس کے پاس آکر کہا۔

'بھائی صاحب فلم اسٹڈیو کہاں ہے؟'

احمد خان نے اس ہیرو نما نوجوان کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا:

"او..... بادشاہ...... وہ سامنے ہے۔"

"اچھا شکریہ۔" نوجوان نے کہا:

'کوئی بات نہیں۔"

احمد خان پھر کرسیاں صاف کرنے میں محو ہوا۔ احمد خان نوجوان

کی آنکھوں میں ایک خواب کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نوجوان کے اس خواب کی کیا تفسیر ہوگی۔

دن کا کاروبار شروع ہوا۔ پھر وہی گرما گرم افواہوں کا سلسلہ ..... اس ہنگامے میں احمد خان نے ایک صورت دیکھی۔ وہ تھی اُس نوجوان کی۔ احمد خان نے اُسے کہا:

"کیا چاہیے بابو۔"

"ایک کپ چائے۔"

"دو کپ نہیں۔"

"نہیں میرے پاس صرف بیس پیسے ہیں۔"

باقی پیسے خرچ ہو گئے۔"

"ہاں۔ پنڈلیوں کا چکر لگاتے ہوئے وہ سب پیسے خرچ ہو گئے جو میں نے گھر سے ساتھ لائے تھے۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ شاید فٹ پاتھ پر سونا پڑے گا۔"

نوجوان نے اپنی سادی حقیقت درد بھری آواز میں کہی۔ احمد خان نے نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"فکر مت کرو۔ احمد خان کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی چیز کی فکر نہیں۔"

نوجوان نے احمد خان سے کہا۔

"دنیا تمہارا احسان زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

وجے کو پناہ مل گئی ورنہ شاید چند دنوں کے بعد وجے نام کا کوئی نوجوان ہی نہ ہوتا۔ احمد خان نے وجے سے کہا۔

"یہ فلمی دنیا ایک ایسی دنیا ہے۔ جہاں آدمی کی شکل وصورت سے زیادہ اس کے کپڑوں کو دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ سو روپے لو اور کپڑے بناؤ پھر سٹیڈیو میں داخل ہو جاؤ۔" وجے نے سو روپیہ لیتے ہوئے کہا:

"خان میں تمہارا یہ احسان نہیں بھول سکتا ہوں۔ قدم قدم پر تم نے مجھے سہارا دیا۔ میں یہ سب بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"فکر مت کرو وجے۔ میں اسلئے پیدا ہوا ہوں کہ تم جیسے نوجوانوں کو سہارا دوں۔" وجے کے کپڑے بھی آگئے۔ اب وجے گھنٹوں سٹڈیو میں رہنے لگا۔ خان کبھی ہدایت کار کے چمچے سے اور کبھی ایکسٹرا سے التجا کرتا تھا۔ کہ وہ وجے کو کام دلائیں پھر وجے اک دن تنگ آکر احمد خان سے کہنے لگا۔

"خان فلمی دنیا میں داخل ہونے کیلئے میرا کوئی چانس نہیں ہے۔ اب میں وطن واپس لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ وہاں تو میں ایک مقامی سکول میں ٹیچر تھا اور ایک سو تیس روپے تنخواہ پاتا تھا یہاں آکے نہ میں گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔"

احمد خان نے سنجیدہ آواز میں کہا:

"ہمت اور صبر سے جب تک آدمی کام نہ لے گا تب تک آدمی

کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وجے تم ڈٹے رہو۔ تمہاری کامیابی ضرور ہوگی پھر احمد خان کے ہوتے ہوئے تمہیں کسی بھی بات کی فکر نہیں۔"

احمد خان کے حوصلوں نے پھر ایک بار وجے کو اسٹیڈیو جانے کے لئے تیار کیا۔ آخر کار اس کے اسٹیڈیو کے ان چکروں نے رنگ لایا۔ اسکو بطور ایکسٹرا کے ایک فلم میں کام مل گیا۔ اسی فلم میں کام کرنے کے بعد اس کو پچاس روپے مل گئے۔ وجے کو ایک بار پھر یہ یقین ہو گیا کہ شاید وہ فلمی دنیا میں وہ خواب پورا کر سکتا ہے۔ جو اس نے بہت پہلے دیکھا ہے۔ اگر وجے کا یہ خواب پورا ہوگا تو اس خواب کو پورا کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ احمد خان کا ہوگا۔ وجے کو دوسری فلم میں ایک چھوٹا پارٹ اور ایک سو روپیہ مل گیا۔ وہ اب تک احمد خان کے پاس رہتا تھا احمد خان اسے ہر وقت کہتا تھا۔

"وجے تم اچھے رہے ہو۔ محنت سے کام کرو منزل بہت نزدیک ہے۔"

وجے محنت کرتا گیا اور دن بدن اس کا نام فلمی دنیا میں جانا پہچانا محسوس ہونے لگا۔

ہدایت کار موتی رام نے اپنی فلم "ایک دن کی بہار" میں وجے کو ہیرو کا رول دیا۔ موتی رام نے وجے کے ساتھ تین سال کے لئے معاہدہ کیا۔ اب وجے کی ماہوار تنخواہ تین سو روپے مقرر ہوئی۔

وجے دوڑتا ہوا آیا اور احمد خان کو اپنی کامیابی کی یہ خوشخبری سنائی۔ احمد خان نے خوش ہوتے ہوئے کہا:

"وجے تمہیں احمد خان کے پاس نہیں رہنا چاہیئے۔ کسی اور جگہ کمرہ لو اب اگر تم میرے پاس رہوگے۔ تو یہ زندگی اب تمہاری فلمی زندگی پر اثر انداز ہوگی۔"

وجے نے کہا:

"لیکن خان یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم ہی وہ سیڑھی ہو جس پر میں چڑھ کر اس مقام پر پہنچ گیا۔ اور اب میں تمہیں ہی چھوڑ دوں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا ہے۔"

احمد خان نے وجے کو سمجھا کر اس بات پر رضامند کیا۔ کہ اب وہ کسی دوسری جگہ رہے اور اب وجے دوسری جگہ رہتا تھا۔ لیکن اب بھی وہ اکثر صبح و شام احمد خان کے پاس آیا کرتا تھا۔ لیکن فلم جہاں مکمل ہونے لگی۔ وہاں وجے نے اب شام کو احمد خان کے پاس آنا چھوڑ دیا۔

فلم مکمل ہوگئی اور اب وجے ہفتے میں ایک بار احمد خان کے پاس آتا تھا۔ فلم بکس آفس پر Hit ہوگئی۔ فلم کے Hit ہونے کے بعد وجے کو تین اور فلموں میں کام مل گیا۔ موتی رام کے ساتھ معاہدہ بھی ختم ہوا۔

وجے اب فلیٹ میں رہتا تھا۔ اب اس کے پاس چھوٹی

موٹر کار تھی ۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کی پانچ فلمیں مارکیٹ میں آگئیں ۔

احمد خان نے وجے کی ایک فلم "غلام کی ملکہ" کو دیکھتے ہوئے اپنے پاس بیٹھے ہوئے تماشہ بین سے کہا ۔

"اس چھوکرے کو میں فلمی دنیا میں لایا ۔"

تماشہ بین نے قہقہہ لگا کے کہا :

"پاگل کہیں کا ۔"

وہ جب سینما ہال سے واپس آیا تو اسے اخبار والے کو چیختے ہوئے دیکھا ۔

"موتی رام کی مشہور ایجاد وجے کمار "سندر کلپنا" میں آرہا ہے ۔" احمد خان کے چہرے پر تبسم پھیل گیا ۔ وہ بڑبڑایا ۔

"موتی رام ۔"

دور سے وجے ایک تیز رفتار موٹر کار میں آرہا تھا ۔ احمد خان نے پکارا ۔

"وجے .... وجے ۔"

لیکن وجے کو کہاں اتنی فرصت تھی کہ وہ دیکھتا کوئی اس سے پیچھے سے پکارتا ہے ۔ پھر تو فلمی دنیا کا یہ اصول ہے کہ نہ ماضی کو یاد رکھو اور نہ ماضی کے ہمدردوں کو ہی یاد رکھو ......

ہریش آنند

یادوں کی دُلہن

"رام داس میرا یہ جنون اسی گاؤں میں شروع ہوا تھا۔ جس جنون نے ایک زہریلے ناگ کی طرح میری زندگی کو ڈس لیا۔ اس جنون نے میری زندگی کو شراب کا غلام بنا دیا۔"

سپرانٹنڈنٹ اشوک نے رام داس سے کہا

رام داس اُس کا ماتحت تھا۔ رام داس اُس کی زندگی کے اُس خوفناک موڑ کے بارے میں سُن رہا تھا۔ اشوک مختلف گاؤں کے چھوٹے چھوٹے ڈاک خانوں کا معاینہ کرتے ہوئے کاجوپور پہنچ گیا تھا۔ کاجوپور کے چھوٹے پوسٹ آفس میں رام داس پوسٹ ماسٹر سے لیکر چپراسی تک کے سب [illegible]

دیتا تھا۔

اشوک نے رام داس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ان ہی سرسبز کھیتوں میں میں نے ایک بار اُس کو دیکھا پسند کیا۔ چاہا۔ دل کے ہر گوشے میں اس کی تصویر بسائی۔ میری زندگی کا وہ مرکزِ توجہ بن گئی"۔ پھر اشوک نے غمناک آواز میں کہا۔

"لیکن یہ سب جھوٹ تھا۔ ایک خواب تھا۔ جس سے میں اپنی خوشیوں کی رانی سمجھ رہا تھا۔ زندگی کی بہار سمجھ رہا تھا۔ وہ کسی اور کی زندگی تھی۔ بہار تھی۔ رانی تھی پھر میرے حصے میں صرف جنون آگیا۔ وحشت آگئی۔ اور شراب کا نشہ آگیا۔"

رام داس حیران تھا۔ کہ اشوک جیسے سخت آفیسر نے کیسے آج اپنی زندگی کی کتاب کے ایک ورق کو ایک دم اس کے سامنے کھول دیا۔ اشوک کی سنجیدہ آواز پھر ایک بار رام داس کے کانوں میں چلی آئی۔

"رام داس مجھے آج شراب نہ ملی۔ نشہ نہ ہوا۔ اس لئے آج میں نشے میں نہیں ہوں۔ میں نے تمہارے سامنے اپنی زندگی کے تلخ واقعہ کو بیان کر دیا۔ رام داس مجھے شراب چاہیے۔ ! ہاں شراب چاہیے۔ میں ایک بار پھر اپنے آپ کو نشے میں مدہوش کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ میں ایک بار پھر یاد دوں

کی دنیا میں چلا جاؤں اور یادوں کی دلہن کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لوں۔"

رام داس نے اشوک کو غور سے دیکھا۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولتا تھا۔ یا بولنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ اشوک نے آگے کہا۔

"رام داس تمہارے گاؤں میں شراب نہیں ملتی۔ لوگ کیسے جیتے ہیں یہاں؟ خیر جیتے ہوں گے۔ لیکن مجھے شراب چاہیئے۔ بے خودی چاہیئے۔ رام داس لاؤ ——— شراب۔"

رام داس نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"لیکن حضور شراب کہاں اس گاؤں میں ملے گی۔ اگر آپ کہیں گے تو چائے کا انتظام کر دوں گا۔ میں نے سنا ہے کہ چائے بھی فرحت اور تازگی بخش دیتی ہے۔"

"رام داس تمہاری یہ تجویز مجھے پسند آئی۔ شراب کا نعم البدل چائے ہی ہوگی۔ رام داس جاؤ ہمارے لیے چائے کا انتظام کرو۔"

رام داس نے اپنی عینک کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"جی بہت اچھا۔"

اس چھوٹے سے پوسٹ آفس کے ساتھ ہی اس کا گھر تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اپنی بیوی کو بلا کر کہا۔

"بڑا صاحب آیا ہے۔ چائے پینا چاہتا ہے۔"
بیوی نے کہا۔
لیکن گھر میں دودھ نہیں ہے۔ تم دودھ لاؤ۔ میں چائے
بنا دیتی ہوں۔"
رام داس دودھ والے کی دوکان پر گیا۔ اور دودھ والے
سے کہا۔
"بھائی دودھ ہے؟۔"
"رام داس جی آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں۔ دن کے اس
وقت دودھ نہیں ہوتا اب تو دو گھنٹے بعد ہی دودھ ملے
گا۔"

رام داس نے تشویشناک آواز میں کہا۔
"لیکن کچھ تو کرو۔"
"مجبوری ہے۔ پاس کے گاؤں سے دو گھنٹے کے بعد ہی دودھ
آئے گا۔"

رام داس مایوس گھر لوٹا۔ بیوی نے اُس سے دیکھ کر کہا۔
"دودھ نہیں ملا ہوگا۔ دن کے اس وقت دودھ نہیں ملتا۔
میں نے اپنی پڑوسن سے بھی مانگا تھا۔ لیکن اُن کا دودھ ختم ہوا
ہے۔ اب کیا کریں؟۔"
"کچھ کرنا ہوگا۔" رام داس نے کہا۔ "تم اشوک کو نہیں جانتی ہو۔

وہ بہت ہی ظالم آفیسر ہے۔ ناراض ہو جائے گا تو مجھے نوکری سے ہمیشہ کے لیے چھٹی ملے گی!"

پھر رام داس کی بیوی نے دودھ کا انتظام کیا۔ اب رام داس خوش تھا۔ کہ کسی نہ کسی طریقے سے چائے بن گئی۔ اُس نے دفتر جا کر اشوک سے کہا۔

"جناب چائے کا انتظام ہو گیا۔"

"ویری گڈ"

"آیئے میں آپ کو اپنے گھر تک پہونچاتا ہوں۔"

"او۔ کے۔"

اُس نے اشوک کو اپنی جھونپڑی میں بٹھا لیا۔ اور اس کے سامنے چائے کا پیالہ رکھا۔ اُس نے کہا۔

"اچھا جناب آپ چائے نوش فرمایئے۔ میں پوسٹ آفس جاتا ہوں۔"

رام داس کے جانے کے بعد اشوک چائے پینے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ عجیب سا نشہ اُس کے ذہن پر چھا گیا۔ وہ پکار اُٹھا۔

"رام داس"

رام داس پوسٹ آفس میں تھا۔ لیکن جب اشوک کا ذہن بے حس ہو جاتا ذہن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی۔ تب اُسے

یاد نہیں رہتا تھا۔ اس کی آواز سن کے رام داس تو نہیں آیا۔ البتہ مالتی آگئی۔

مالتی نے کہا۔ "کیا چاہئے آپ کو؟"۔

اشوک نے نگاہیں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"کون ہو تم؟"۔

"میں مالتی ہوں"۔

"مالتی!"

"ہاں رام داس کی بیوی ہوں"۔

اشوک اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چیخ پڑا۔

"نہیں جھوٹ ہے۔ تم وہی ہو جو مجھے سرسبز کھیتوں میں ملی تھی۔ تم وہی ہو۔ جس کو میں نے چاہا۔ تم میری یادوں کی دلہن ہو۔ —— آجاؤ —— یادوں کی دلہن۔ میری بازوؤں میں آجاؤ —— نا —— ان بازوؤں ——"

مالتی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ تم نشے میں ہو۔ تم بہک رہے ہو۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔"

اشوک نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یادوں کی دلہن تم نے مجھے بہت پہلے مدہوش کیا۔ اب میں اس مدہوشی میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔ میں نے تم

کی۔ میں تجھے پانا چاہتا ہوں۔"

مالتی چیختی رہی۔

"ہٹ — ذلیل — کمینے — پاجی۔ —"

لیکن مالتی کے ان بے ربط الفاظ کو بند کرنے کے لئے اشوک نے اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ لئے۔ آواز ڈوب گئی۔ یادوں کی دلہن لُٹ گئی۔ رام داس ڈرتا ہوا گھر آیا مالتی رو رہی تھی۔ اشوک اپنے چائے کے پیالے سے بقیہ چائے پی رہا تھا۔ رام داس نے خلیش بھری آواز میں اشوک سے کہا۔

"کیا پی رہے بابو۔"

"رام داس تم"۔ اشوک نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔

"چائے — چائے — پی رہا ہوں۔"

"کیوں چائے پی رہے ہو بابو؟ — کیوں؟ — تمہیں یہ چائے پینے کا کوئی حق نہیں۔ اس چائے میں اُس عورت کی چھاتیوں سے نکلا ہوا دودھ ہے جس کی عزت تم نے لوٹ لی۔"

اشوک چیخ پڑا

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

رام داس ہنس پڑا۔ اور غصّے میں کہا۔
"کمبخت تم نے اپنی ماں کو لوٹ لیا۔"
اشوک پاگلوں کی طرح کہنے لگا۔
"نہیں ــ نہیں ــ میں نے ماں کو نہیں لوٹ لیا۔ میں نے یادوں کی دُلہن کو لوٹ لیا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں نے یادوں کی دلہن کو لوٹ لیا۔"
لیکن حقیقت یہ تھی۔ کہ یادوں کی دُلہن لوٹنے والے نے خود اپنے آپ کو لوٹ لیا تھا۔

گناہوں کا پجاری

"تمہیں اپنے سوچنے اور سمجھنے کا ڈھنگ بدلنا ہوگا۔ ضمیر کو کچل کے رکھنا ہوگا۔ زندگی کو گناہوں کا غلام بنانا ہوگا۔ ایمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے ہوں گے۔ سچائی کو دیکھ کے منہ موڑنا ہوگا۔ یہاں تک تمہیں اپنی زندگی کا حرف و نحو بدلنا ہوگا۔"

اُس نے اپنے آپ سے آگے کہا۔

"نہ جانے میرے قدم مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔"

کیونکہ اُس کی اپنی زندگی اُس کے اپنے ہاتھوں میں نہ تھی۔ آدمی کا ضمیر جب مر جاتا ہے۔ سوچ و سمجھ سو جاتا ہے۔ تب وہ حیوان بن جاتا ہے۔ چند دنوں پہلے وہ حیوان نہیں تھا۔ تب اُس کا ضمیر بیدار تھا۔ تب اُس کا سوچ و سمجھ زندہ تھا۔ تب وہ انفرادی طور زندگی کے ہر پیچ و خم کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ اُس ہی ضمیر نے اُس کو سیٹھ دھنی رام سے

یہ کہنے پر مجبور کیا۔

"سیٹھ میں ایسا کام نہیں کر سکتا ہوں"۔

تم ایسا کام نہیں کرو گے تو بھوکے مر جاؤ گے۔ تمہارے چھوٹے بھائی ایڑیاں رگڑ رگڑ کے دم توڑ لیں گے۔ تمہاری ماں یہ منظر دیکھ کر تمہاری جوانی کا ماتم کرے گی۔"

"تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے، سر چھپانے کے لئے جگہ اور پیٹ بھرنے کے لئے خوراک یہ سب اگر مہیا نہ ہو گا تو کیا ہوا؟ لیکن اپنے سر کو جھکانا نہیں پڑے گا۔ غیرت کو قتل نہیں کرنا پڑے گا۔"

سیٹھ نے ہنستے ہوئے واپس کہا۔

"تم بہت کچھ کہہ سکتے ہو۔ لیکن یہ سب کہہ کر بھی تمہیں ایک دن واپس آنا پڑے گا۔ پھر میں جو کام کرنا تو لوں گا۔ کرنا پڑیگا۔"

اور آج وہ سیٹھ دھنی رام کے پاس جا رہا ہے

کیسے اور کیوں؟

جب اس کی ماں نے اُس سے کہا۔

"پانچ سال تمہاری منطق سُنی۔ تمہاری اونچی اونچی باتیں سُن لی۔ لیکن نہ تمہاری منطق سُن کے ہمارا پیٹ بھرا اور نہ ہی تمہاری اونچی باتوں سے۔ جب تمہارا باپ زندہ تھا کیا ٹھاٹھ باٹھ تھی۔ ایک یہ زمانہ کہ دو وقت کی روٹی نہیں ملتی۔ ہائے تو نوجوان بیٹا ہے۔"

یہ سب سُن کے اُس کے احساسات بُری طرح مجروح ہوئے تھے۔ جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ یہ سب ہوا تھا اور یہ ہو کر وہ اپنے آپ کو بے سہارا پا رہا تھا۔ وہ بے سہارا اس لئے تھا کہ اُس کے جذبات اور احساسات کی کوئی قدر نہیں کرتا تھا۔ سب ہی سیٹھ دھنی رام کی طرح پیسوں کے متوالے تھے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوا تھا کہ وُہی کیوں ان متوالوں سے الگ راستہ چن لیں۔ اُس کو بھی ان کے ساتھ ایک نیا گیت گانا چاہیئے۔ ایک ایسا گیت جس کا کوئی ربط نہ ہو۔ جیسے ایک بے اصول زندگی کا کوئی ربط نہیں ہوتا ہے۔ اُس کے یہی بے ربط قدم سیٹھ دھنی رام کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ہر دم وہ یہ سوچتا تھا۔ کہ زندگی نہ ٹوٹنے والی مصیبتوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ ایک اندھے نے اُس کا راستہ روک لیا۔

"بابو مجھے پار لے جاؤ۔۔۔ میں راستے سے بھٹک گیا ہوں۔"

اُس نے خاموشی سے اندھے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کو سڑک پار کرا لیا۔ اندھے نے کہا۔

"شکریہ بابو۔۔۔ تم میرے رہبر ثابت ہوئے۔"

اندھے کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالکر رشید نے کہا۔

"میں تو خود ایک بھٹکا ہوا آدمی ہوں۔ جس کے قدم نہ جانے کس راستے پر بڑھ رہے ہیں اور نہ جانے میرے یہ قدم مجھے کہاں لے جائیں گے۔"

"تم تو آنکھ والے ہو پھر کیوں بھٹک رہے ہو۔" اندھے نے کہا۔ "راستہ تلاش کرو۔ ابھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ سن رہے ہو تم ۔۔۔!"

لیکن رشید تو کب کا چلا گیا تھا۔ اُس کے بے ربط قدم دھنی رام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ اپنے الٹے سیدھے قدموں کے سہارے دھنی رام کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دھنی رام نے اُس سے دیکھ کر کہا۔

"آ گئے تم!"

"ہاں آگیا ہوں ۔۔۔ اپنے ایمان کے پیرہن کو چاک کر کے آگیا۔ ضمیر کی زبان کاٹ کے رکھ دی۔ اصولوں کو بے حس کر دیا۔ جذبات اور احساسات کو قتل کر دیا اور اب میں بے ایمانی کے راستے پر چلنے کے لئے آمادہ ہوں۔"

"میں جانتا تھا کہ تم آؤ گے۔ تم آ گئے۔ اس کے بغیر تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ آؤ میرے ساتھ میں تمہیں اپنے دوسرے ساتھیوں سے ملاتا ہوں۔"

سیٹھ دھنی رام نے اس کو ایک بڑے کمرے میں لایا۔ یہاں پندرہ آدمی پہلے ہی موجود تھے۔ دھنی رام نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آج تمہارے اس گروپ میں ایک نیا آدمی شامل ہو رہا ہے

اس کا نام رشید ہے۔ تمہاری طرح یہ بھی بھوک افلاس اور غربت کا مارا ہوا ہے۔ میں نے اس کو پناہ دی۔ اب یہ بھی عیش و خرم کی زندگی گزار سکتا ہے۔"

سیٹھ دھنی رام نے رشید سے کہا۔

"آو میں تمہیں ان لوگوں سے ملاتا ہوں۔ یہ برجو ہے۔ جیب کاٹ لینے میں سب سے بڑا استاد ہے۔ یہ رستم خان ہے۔ سینما ٹکٹیں بلیک کرنے میں یہ سارے شہر میں مشہور ہے۔ یہ رامو ہے۔ چرس اسمگل کرنے میں سب سے قابل آدمی مانا گیا ہے ———— اور یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس طرح سب کے ساتھ رشید کا تعارف ہوا۔ وہ گناہوں کے اس مسکن میں ایک بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

"اور آج تمہاری تربیت کا پہلا دن ہے!" دھنی رام نے کہا "رستم خان جس بھکاری کے پاس پانچ ہزار نقد جمع ہیں آج اُس بھکاری کو رشید لوٹ لے گا۔ تم اُس کے ساتھ رہو گے۔" دھنی رام نے رشید سے کہا۔

"رشید اگر تم کامیاب لوٹ آؤ گے تو تمہیں ایک ہزار روپیہ ملے گا اور اگر تم پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو تمہیں قید سے آزاد کرانا ہمارا فرض ہوگا۔ لیکن اگر تم نے میرے ساتھ دغا بازی کی تو تمہیں کڑی سے کڑی سزا مل سکتی ہے۔"

شام کا سناٹا پھیل گیا تھا۔ گناہ کا آنچل سیاہ بھوت کی طرح رشید کے ارد گرد لپٹ گیا۔ نہ جانے اُس کے ہاتھ پیر کیوں کانپ رہے تھے۔ لیکن رستم خان نے اُس کے مزاج میں ٹھہراؤ لایا۔

"چلو"

وہ دونوں سیاہ تارکول سڑک پر چل رہے تھے۔ رشید نے اپنے پھٹے ہوئے قمیض کے کالروں کو اونچا کیا تاکہ اُس کا چہرہ چھُپ جائے۔ لیکن یہ سب کر کے وہ ایک بھیانک سائے میں تبدیل ہو گیا جیسے کالے رات کے بیچ ایک گناہوں کا پُجاری جا رہا تھا۔

وہ چیخ پڑا۔

"نہیں"

رستم خان نے کہا۔

"کیا ہُوا۔؟"

"کچھ نہیں"

"تم بہک جاتے ہو۔"

اس نے رستم خان کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ لیکن رات کی سیاہی میں وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہ پڑھ سکا۔

"وہ دیکھو ـــــ وہ ـــــ!" رستم خان نے رشید سے کہا۔

"وہ قبرستان ہے وہاں پر ہی وہ بھکاری سویا ہوا ہوگا۔ تو اُس کی شیروانی اُتار لینا۔ وہ اس میں اپنے پیسے رکھ لیتا ہے ـــــ ہاں

ایک اور بات سنو۔" رستم خان نے اپنے جیب سے رامپوری چاقو نکالتے ہوئے کہا۔

"اگر اس نے کسی قسم کی ہچکچاہٹ کی تو اس رامپوری چاقو سے اُس سے سالا دینا۔"

چاقو کو دیکھ کر رشید نے کہا۔

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"جیسا میں نے کہا ویسا کرو۔"

رشید نے خاموشی سے چاقو اپنی جیب میں ڈال دیا۔ اندھیرے میں اُس کے قدم قبرستان کی طرف بڑھ گئے۔ ایک قبر کے ساتھ بھکاری سو رہا تھا۔ وہ اپنے خوابوں میں محو تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے رشید ٹھٹھک گیا۔ مرے ہوئے ضمیر کی دبی ہوئی چنگاری نے ایک بار پھر اس سے جھنجھوڑ دیا۔

"تم ایک بے بس اور مظلوم پر ظلم کر رہے ہو۔ تم سچ مچ گناہوں کے پجاری بن گئے۔ تمہارے اندر کا انسان مر گیا ہے۔"

"نہیں ــــ نہیں ــــ میں مجبور ہوں۔ بے بس ہوں۔ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔"

وہ اپنے آپ سے کہہ اُٹھا۔

"میں زندگی کا ہارا ہوا کھلاڑی ہوں۔"

"نہیں ــــ تم ہارے ہوئے کھلاڑی نہیں ہو۔ بالکل تم زندگی

کے دھوپ چھاؤں سے بوکھلا گئے۔ تم وقت سے پہلے گھبرا گئے۔ ہمت کا آنچل ہاتھوں سے چھوڑ دیا ہے۔"

"نہیں" وہ چیخ پڑا۔

بھکاری اس چیخ سے جاگ پڑا۔ اُس نے کہا۔

"کون؟"

رشید نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ اس کا ہاتھ اس کی شیروانی طرف بڑھ گئے

بھکاری کہہ پڑا۔

"یہ کہاں سے گناہوں کا پجاری آگیا"

اندھے نے اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کو رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ تو ہبر رہبر کا ہاتھ ہے۔ بھلا ایک رہبر کا ہاتھ کیسے ایک گناہوں کے پجاری کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ شاید مجھے وہم ہو گیا ہے۔"

رشید نے تیزی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے گم سُم کھڑا رہ گیا۔ اندھے نے رشید کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ رہبر کے لبادے میں گناہوں کا پجاری نہیں بن سکتا ہے۔

وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

ختم

آشوب آگہی

عقل کو زہریلی تلوار سے ٹکڑے کر دو۔ اپنے ہر حساس لمحے کو
پھانسی پر چڑھاؤ۔ تب پیار کر پاؤ گے

لالی ایک اچھی لڑکی ہے۔ میرے دل میں اُس کے لیے ہمدردی ہے۔ لیکن ذِل کیوں ہمدردی کے لفظ پر اچنبھا میں پڑ جاتا ہے یہ بیہودہ لفظ ہے۔ غرض کے لبادے میں یہ لفظ اُلٹے ٹیڑھے معنی لیے ہوئے خنجر سا کام کرتا ہے۔

اور جب کوئی پی۔ ایچ۔ ڈی اپنی ناک بھوؤں کو نفرت سے ایسے سکوڑ لیتا ہے۔ جیسے دوسرے لمحے قیامت آنے والی ہے کیوں کہ اُس کے لئے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس آدمی قیامت سے ہے وہ اپنی یا زوال سیٹ پر بازو لہرا کے قبضہ کرتا ہے۔ تاکہ وہ قیامت اُس کو اپنی گرفت میں نہ لے۔ ایسے لمحے میں مجھے بڑی کوفت ہوتی

ہے۔ پھر ---- پھر ایسے ہی لمحے میں میری نظر "لالی" پر پڑتی ہے۔

وہ کسی آئینہ میں اپنی صورت دیکھنے کی سعی کرتی ہے

اخبار والا چیخ چیخ کے کہتا ہے۔

"ہندوستانی نے ہندوستان کے جھنڈے کو جلا دیا۔"

میں اپنی سیٹ سے کھڑا ہوا۔ جھنڈے کو ڈھونڈتا ہوں۔ آگ کو دیکھتا ہوں۔ ہندوستان کی بازیافت میں مگن ہوتا ہوں۔ لیکن وہاں صرف ایک ہی چیخ آتی ہے۔

"ہندوستانی نے ہندوستان کے جھنڈے کو جلا دیا۔"

مگر لالی ایک اچھی لڑکی ہے۔ میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ اُس کو میری کہانیاں بہت پسند ہیں۔ اس لئے مجھے اُس سے بہت نفرت ہے۔

ہاں ذہین ہونا اچھی بات نہیں ہے۔ خطرناک ہے۔ اس لئے کچھ لوگ مرجاتے ہیں۔ ہر ایک جس کو آج "پاگل" کہہ کے پکارتا ہے۔ جانتے ہو وہ کل کیا تھا۔ کوئی نہیں جاننا چاہتا ہے کوئی جان بھی نہیں پائے گا ---- چھوڑو"

برقعہ پوش عورت اپنے دائیں انگوٹھے کے ناخن پر لگائی ہوئی

پالش کو تکتی ہے اور جب میری نظر اُس کی نظر سے اُلجھ جاتی ہے۔ تب وہ فوراً اُس ہاتھ کو برقعہ میں بند کرتی ہے۔

کوئی کہتا ہے۔

"رسومات جھوٹے۔ تصورات جھوٹے ۔۔ ہم جھوٹے ۔ تم جھوٹے ۔"

اور برقعہ پوش عورت فوراً اپنے ہاتھ کے رنگ کئے ہوئے انگوٹھے کے ناخن کو سرِ راہ نکالتی ہے۔

میں سر تھام کے رہ جاتا ہوں۔

"لالی تم جھوٹی ہو۔ تمہارا نام لالی نہیں ہے۔ ہاں مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا کیا نام ہے۔ تمہارا نام غوث النساء ہے۔ جھوٹی ۔۔۔ مجھے تمہارے اس جھوٹ پر کبھی کبھی پیار آتا ہے۔"

وہ لڑکی کہتی ہے۔

"وقت سے پہلے تم نکل پڑے۔"

"میں وقت سے پہلے نکلتا ہوں۔"

"تم جو پڑھتے ہو۔ لکھتے ہو ۔۔۔ اس لئے ۔۔۔!"

میں جملہ کاٹ کے لکھتا ہوں۔

"صرف لکھتا ہوں۔"

"دشتبنوں کو لاؤ۔ آدمیوں کو نکال لو۔ آدمی آدمی نہیں رہے

مشینیں کام کرتی ہیں۔ آدمی مشین نہیں بن سکتا۔ ترقی کی رفتار بد لنی ہوگی ـــــ بدل دو۔"

اقتصادیات کے طالب علم نے دوسرے اقتصادیات کے طالب علم کو سمجھایا۔

میں سوچ میں پڑتا ہوں۔

قدریں بدل رہی ہیں ـــــ بدلنے دو۔

ہم اور تم کیوں فکر کریں۔

آؤ فکر کو گولی ماریں۔

لالی کی آنکھیں کہتی ہیں۔

"تمہیں میرے جھوٹ پر پیار نہیں آنا چاہئے۔ پیار بڑی بلا ہے۔ آگ ہے۔ طوفان ہے۔ پیار کے جھگڑوں سے کوئی آزاد نہیں ہو پاتا۔"

"نہیں ـــ نہیں ـــ میں تم سے پیار نہیں کرتا ہوں۔"

آج خاکروبوں نے پھر ہڑتال کی۔ شہر کا کیا ہوگا؟ گندگی پھیل رہی ہے۔ بڑے بڑے ہورہے ہیں۔ خاکروب۔ پیٹ کے واسطے گندگی پھیلا رہے ہیں۔ آؤ اب کی بار ان سب کی پیٹیوں میں گندگی بھر دو۔ وہ ہٹتے ہیں۔

"اپنے ہوسٹے تو ندوالے سیٹھوں کے پیٹوں سے ہوا نکال دو۔

اور وہ ہوا ہماری پیٹوں میں بھر دو۔"

اچھا ہوگا یہ تبادلہ۔

اور یہ میرا وہ شاعر دوست انگریزی میم کی گوری موٹی موٹی ٹانگوں کو تکتے ہوئے انگریزی وسکی پیتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔

"بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے خود کو سمجھنے والے گہرا۔"

سادھوؤں نے راجدھانی میں جلوس نکال لیا۔ سادھو اور جلوس۔ یہ لوگ کب سے دُنیادار بن گئے۔

اچھا ہوگا ہم سادھو بن جائیں۔

اُف ــــ انتشار مت پھیلاؤ۔ اُلجھ مت جاؤ

جذباتی ہو۔

تب لالی یا غوث النساء یا کوئی اور آکے میرے کان میں کہہ دیتا ہے۔

"عقل کو زہریلی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اپنے ہر حساس لمحے کو پھانسی پر چڑھا دو۔ تب پیار کر پاؤ گے۔"

○○

جُدا جُدا راستے

جو آپ مرے وہ کیوں دوسروں کے مرنے پر روئے۔ جو آپ لہو سے اپنے کو دھوتا رہے وہ کیوں دوسروں کا لہو دیکھ کر تڑپے۔ شور اور ہنگاموں سے ہم بہت دُور چلے گئے۔ رشتے ضرور ہیں۔ لیکن دنیاداری کی باتیں اب بھی ذہن کو چھو لیتی ہیں۔ ایک ایسی آواز کانوں تک آتی

"کہاں جانا ہے بابو؟"

میں کہتا ہوں

"کہاں لے جاؤ گے۔"

"جہاں تک یہ بس جائے گی۔"

"وہاں تک لے جاؤ۔"

"تیس پیسے۔"

"ہاں تیس پیسے۔"

کچھ پیسے کنڈکٹر کے پاس چلے گئے۔ لیکن زنجیر ختم نہیں ہوئی۔ میری بغل میں بیٹھا ہوا پنڈت کہتا ہے۔

"پھوٹا ہے۔"

"پھوٹا ہے" میں کہتا ہوں۔

وہ حیرت سے میری طرف دیکھ لیتا ہے۔ جیسے اخلاق کی زنجیر ختم ہوئی اور بوڑھا کہتا ہے۔

"اچھی بات نہیں ہے۔"

میں کوئی جواب نہیں دیتا ہوں۔ تھک جو جاتا ہوں۔ پنڈت بوڑھے سے کہتا ہے۔

"اچھے تھے وہ پرانے وقت جب پانچ آنے میں گوشت ایک پاؤ ملتا تھا۔"

میں دوسری سیٹ میں بیٹھے ہوئے آدمی سے کہتا ہوں۔

"زنجیر کٹ گئی۔"

وہ اپنے کھویا نہ کے سامان کو سنبھال لیتا ہے۔ لیکن سنبھال نہیں پاتا ہے۔ کب تک آدمی چیزوں کو سنبھالتا رہے۔ اپنے آپ کو سنبھالے یا حالات کو سنبھالے بوڑھے نے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔

"تب بھید بھاؤ نہیں تھا۔ ہندو نہیں تھا مسلمان نہیں تھا۔

انسان تھے صرف انسان۔"

اب تو یہ خیال کی زنجیر تھی جو کٹ گئی۔ لیکن اب خیال کے پرستار نہ رہو۔ چلے آؤ ادھر بدل جاؤ۔

پنڈت نے کہا۔

"تم چپ کیوں ہو؟"

میں نے کہا۔

"بزرگوں کے سامنے زبان بند رکھنا سیکھ لیا ہے۔"

اخلاق کی زنجیر جڑ گئی۔ میری طرف وہ تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا اور ہم تعریف کے غلام ہو جاتے ہیں۔ روحانی قدروں کا زمانہ نہیں رہا۔ کوئی وقت کا حاتم بھی نہ رہا۔ کسی بھی لیلےٰ کی ضرورت نہ رہی۔ نہ صحرا کی تلاش ہی رہی۔ پھر بوڑھے کو جنگل کیوں پیارے رہتے ہیں۔ یہ زنجیر اچھی نہیں ہے۔

بوڑھا مجھے ٹوک دیتا ہے۔

"بولو — کچھ تو بولو۔"

"کیا بولوں؟"

"جو تمہارے ذہن میں ہے۔"

"خدا میرے دل میں ہے۔"

"یہ سوال نہیں ہے۔"

میں زنجیروں کے گھیراؤ کو بھول جاتا ہوں۔ ہاتھ میں نئی ہوئی چاہیئے

ناول کو بھول جاتا ہوں خالی الذہن تھا۔ پھر بھی ذہن میں کچھ پڑا ۔ جو فوراً لب پر آ گیا۔

"انا الحق ــــ بتاؤ ــــ انا الحق ــــ کا معنی ــــ"

وہ کھو جاتا ہے۔ بوڑھے کو کھونے دو۔ چلو اپنی ہی زنجیر میں اُلجھ جانے دو۔ میں نے بوڑھے کو پکڑا۔

"تم جھوٹے ہو۔"

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم بھی سچ نہیں ہو۔"

میں نے اُس کا گریبان چھوڑ دیا۔

"جواب دو۔"

"میرے پاس جواب نہیں ہے۔"

"منزل آ رہی ہے۔"

وہ کہتا ہے۔

"تمہاری منزل بہت دُور ہے۔"

میری منزل کہاں ہے ــــ میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں۔ یہ سوچ کی زنجیر کٹ نہیں جاتی۔

حضرت بل آ گیا۔ میرے تھکے ہوئے قدم گاڑی سے باہر آ گئے۔ بوڑھے نے پکارا۔

"اجنبی اِدھر آؤ۔"

میں اُس کے قریب آگیا۔ اُس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"نہیں جانتا ہوں۔"

بوڑھے نے کہا۔

"چھوڑ دو سب کو چھوڑ دو۔ میرے ساتھ آؤ اُن پہاڑوں میں۔ وہاں ق۔رت ہے قدرت تمہیں وہاں جانا ہوگا۔"

میں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں نہیں جا سکتا ہوں۔ زنجیریں ہیں۔ یہ زنجیریں بڑی مضبوط ہیں۔"

بوڑھے نے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"جاؤ ـــــ جاؤ۔ تمہاری جگہ ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔ اپنی زنجیروں کو سنبھالے رہو۔ تمہاری یہی زنجیریں پھانسی کا پھندا بن جائے گی۔"

وہ اپنے راستے پر گیا۔ میں اپنے راستے پر گیا۔ پھر کبھی ملیں گے۔ اگر کبھی ملیں گے تو کیا ایک دوسرے کو پہچان پائیں گے۔

●●

نیلام

وقت کے پرسنے میں خون جگر کی داستان لکھتا رہا۔ کبھی اس داستاں میں فاروق بھی شامل تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہی نہیں تھا۔ نئے نئے کردار نئے نئے انداز سے پیش کرنے کا جذبہ موجود ہی نہیں تھا۔ فاروق کی شاعری نے مجھے کہانیاں لکھنے پر اکسایا۔ پھر زندگی کے اچھے بُرے کردار آتے رہے۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد ہی فاروق کو ایک روز نامہ نکالنے کی سوجھی۔ ہم دونوں نے مل کر "سنگ ساز" کو پروان چڑھایا۔ چند ہی دنوں میں اپنی بیباکی کی وجہ سے "سنگ ساز" عروج کی منزل کی طرف رفتار سے دوڑنے لگا۔ کوشش یہی تھی کہ کسی کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ لیکن پردے جب گر جاتے ہیں کچھ اچھے

چھرے بھیانک بن جاتے ہیں۔ اجمل خان بندوق والے کے ہاں دولت کی نہریں بہتی تھیں۔ لیکن اگر اس نہر میں کالا بازار کی دولت بہتی ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟۔ بندوق والے کو یہ بات پسند نہ آئی کہ کوئی اس راز کو جو کبھی راز نہ تھا پردہ اٹھائے۔ مجھے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا!

"جناب آپ اس پرچے میں اپنی تقریر کی ترد ید کیجیے۔ یہی آپ کے حق میں اچھا ہوگا۔"

میرا دوست کہہ پڑا۔

"اگر کہیں گے۔"

سیٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"معقول معاوضہ دیا جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"اگر نہیں کریں گے"۔

سیٹھ نے غصے میں کہا

"تو آپ کا پرچہ بند ہوگا۔ یہاں تک آپ کی زبان بھی بند ہوگی۔"

لیکن میں جوشیلا آدمی تھا۔ میں بھی کب سیٹھ کے جھانسے میں آنے والا تھا۔ لیکن میرا دوست تجارت کے ترازو پر نظر رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے صاف اور واضح الفاظ میں مجھ

سے کہا۔

"میاں مجھے یہ پرچہ چلانا ہے۔ اس پرچے کو زندہ رکھنے کے لئے ٹھن ٹھن کرتے ہوئے پیسے چاہیئے۔ اس لئے مجھے سیٹھ کے ساتھ صلح کے لئے ہاتھ بڑھانا ہوگا۔"

میں نے اپنے دوست سے کچھ نہ کہا۔ ہاں اخبار "سنگ ساز" کو ہمیشہ کے لئے سلام کیا۔ چپکے سے اپنے گھر واپس آئے۔ ایمان کو سینے سے لگائے۔ دوسرے دن ایک دفتر میں دو سو روپے کی کلرکی کی نوکری شروع کر لی۔

یہ تو سچ ہے کہ اخبار کا ہاتھ سے جانے کا افسوس بہت دنوں تک رہا۔ لیکن اب فرصت کے لمحات اپنی کہانیوں میں صرف ہونے لگے۔ ایک دن مقامی کالج میں "بزم افسانہ" میں شمولیت کرنے کی دعوت مجھے دی گئی۔ تعارف کرنے والے نے میرا تعارف اس انداز سے کرایا کہ سب محسوس کرنے لگے کہ اس شہر کا ادب میرے بغیر نامکمل ہے۔ "سفر اجاڑ ویران دن" کی کہانی نے تمام محفل میں سکوت طاری کر دیا۔ کہانی تو کب کی ختم ہوئی تھی۔ لیکن خاموشی بہت دیر کے بعد ٹوٹ گئی۔ میری کہانی نے تمام سامعین کو متاثر کیا۔

لیکن میمونہ کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئی تھی۔ محفل ختم ہونے کے بعد وہ میرے پاس آئی۔ کہانی کی اختتام کے بارے میں وہ کچھ

وضاحت چاہتی تھی۔ لیکن دراصل وہ اپنی اظہار محبت میں ابتدا
چاہتی تھی۔ وہ گندمی رنگ کی دلکش لڑکی تھی۔ میرے دل میں بھی
اُس کے لئے محبت جاگ پڑی۔ میں بھی اُس کو چاہنے لگا۔ پھر اکثر
ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

ایک دن میں نے میمونہ سے کہا۔

"تمہاری شادی ہوگی!"

"ہوگی"۔

"لیکن تم بھول رہی ہو۔ میں دو سو روپئے کی کلرکی کرتا ہوں۔"

وہ مسکرائی۔

"لیکن تم بھی بھول رہے ہو کہ تمہارے پاس بہت دولت
ہے"

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس دولت ــــ میں نہیں سمجھا"

"تمہاری کہانیاں تمہاری دولت ہے۔"

میں اُس کو پیار بھری نظروں سے تکنے لگا۔ اُس نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

"تمہاری آنکھوں سے خمار ٹپکتا ہے۔

میں نے قہقہے لگاتے ہوئے کہا

"زکام ٹپکتا ہے۔"

"زکام!"

"ہاں ہر اچھی بات کے بعد میری ناک اور آنکھوں سے زکام ٹپکنے لگتا ہے۔"

میں میمونہ کو پا کے مسرور ہو جاتا۔ ایک اچھی شریک حیات پانے کے بعد آدمی اپنے آپ کو مکمل محسوس کرتا ہے۔ لیکن میں میمونہ کو نہیں پا سکا۔ وہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ میں جب اُس کے باپ کے سامنے میمونہ کو اپنی شریک حیات بنانے کا رشتہ لے کر آیا۔ اُس نے کہا۔

"میاں تم دو سو روپے کی کلرکی کرتے ہو۔ موٹر تمہارے لئے خواب ہے۔ سکوٹر تم زندگی بھر کما کے بھی حاصل نہیں کر پاؤ گے۔ یہاں تک ایک سائیکل حاصل کرنا بھی تمہارے لئے ناممکن ہے۔ پھر یہ بتاؤ میں اپنی لڑکی کا ہاتھ ایسے آدمی کے ہاتھ میں کیسے دوں۔"

میں نے اُس کو لاکھ سمجھایا کہ زندہ رہنے کیلئے نہ تو موٹر کی اور نہ ہی سکوٹر کی ضرورت ہے لیکن وہ ہر سوال کا صرف یہی جواب دیتے رہے کہ زندہ رہنے کے لئے صرف دو وقت کی روٹی نہیں چاہیئے۔ زندگی کی آسایش چاہیئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں زندگی کی ہر بازی ہارتا ہوں۔

چند دنوں تک میں اس سوچ میں مبتلا رہا کہ مجھے ایسا کیا

سینے سے لگا کے کیا ملا؟۔ دوسو روپے کی کلرکی، میمونہ کی جدائی۔ لیکن آدمی کب تک سوچ میں بھی پڑا رہے۔ ایک بار میں پھر زندگی کے دائرے میں خود کو پھنسنے لگا۔ ان دنوں میں ایک دوسرے شہر میں تھا جب میمونہ کی شادی ہوئی چند آنسوؤں ضرور بہا لیے۔ پھر اپنی بے کیف زندگی میں مست ہوئے۔ دو تین سال بعد جب اپنا شہر واپس آیا تو اپنی گلی کوچوں کو پہچان نہ پایا اپنے دوست فاروق کو پہچان نہ پایا۔ جو ایک بہت بڑا امیر بن گیا تھا۔ جس کا اخبار اب ہزاروں میں فروخت ہوتا ہے اور جس کے پہلو میں میمونہ لچکتی مسکراتی ہوئی چلتی تھی۔

اب مجھے اس بات پر تعجب نہ ہوگا اگر میں اپنے ضمیر کو کسی چوراہے پر نیلام کردوں گا۔ اس دفعہ کوئی خریدار بھی نہیں ملے گا۔

۰۰۰

وارث کی تلاش

"اپنی نگوڑی قسمت ہی ایسی ہے۔" پان داں سے پان اٹھاتے ہوئے چھوٹی بیگم نے اپنی بوڑھی نوکرانی سکینہ سے کہا۔ سکینہ نے پان داں کا ڈھکن بند کرتے ہوئے کہا

"الو بیگم صاحبہ آپ کو اس بات کا علاج کرنا چاہیے۔"

چھوٹی بیگم نے کہا۔

"کتنا سوچ لیا۔ اس کمبخت نگوڑی دماغ میں کچھ نہیں آتا۔"

چھوٹی بیگم چھپر کھٹ پر اوندھی لیٹی۔ سکینہ فکرمند تھی اس لیے اُس نے کہا۔

"یہ نواب مختار الدین ہیں نا — آپ کے آنے سے پہلے ایک دن بڑی بیگم سے بکو تو — میرے کو معاف کر دیو تب آپ اُن سے پاشا آپ کے پاس آنے لگے۔ لیکن بچہ نہیں آیا۔ پاشا کا نام

بلوا نہیں آیا ۔۔۔ کہیں پھر کسی دن آپ کو نکو نکو کہے ۔
میرے کو معاف کر دیو ۔۔ پھر تیسری بیگم آئے گی ۔۔۔ ایسا
موقعہ نہیں آنا چاہیئے ۔"

سکینہ ٹھیک کہتی تھی ۔ نواب عمادی الدین میلی قمیض کو بدلنے میں تھوڑی دیر لگا دیتا ہے ۔ لیکن بڑی سے چھوٹی بیگم لانے میں دیر نہیں کر دیتے ۔ چھوٹی بیگم کو واقعی فکر لاحق ہو گئی ۔ بیس میل دور گاؤں رتن پور کے ٹھیکیدار اپنے والد نواب علی خان کے پاس رہ کر خود تو بڑی ٹھاٹ سے پل کر جوان ہوئی تھی ۔۔۔ پھر ان ہی دنوں نواب عمادی الدین اپنی لمبی لمبی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اس کے گاؤں پہنچ گیا تھا ۔ چھوٹی بیگم کا صندل جیسا چمکتا ہوا چہرہ دیکھا کہ دل سے اختیار قابو سے باہر ہو گیا ۔ نواب علی خان کو دل کا حال بیان کیا ۔ نواب کی عمر اُن دنوں تیس سال تھی ۔ چھوٹی بیگم اٹھارہ سال کی تھی ۔ لیکن نواب نواب تھے ۔ بھلا پھر نواب علی خان کیوں رشتہ ہاتھ جانے دیتا ۔ یہ وقت عجیب تھا ۔ نوابوں کے نام پر سب کچھ نثار کرنے کے لئے لوگ تیار رہتے تھے ۔ لیکن اب تو دس سال ہو گئے اس شادی کو بھی ۔ ہاں اب تک چھوٹی بیگم کی گود خالی تھی ۔

تھوڑی دیر کے بعد چھوٹی بیگم کی فکر رفع ہو گئی ۔ نواب اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور کہنے لگا ۔

"کیوں چھوٹی بیگم۔۔۔ آج تمہارا چہرہ کیوں سوجھا ہوا ہے؟"

پھر نہ جانے کیوں کھکھلا کے ہنس پڑی۔

اُس شام رمضان کو جوان کلیبوری ہاجرہ نے ایک لڑکی اپنے ساتھ حویلی میں لائی۔ حویلی کے قالینوں پر دونوں نے پھونک پھونک کے قدم رکھے۔ ہاجرہ نے فرشی سلام کرتے ہوئے کہا۔

"ام بیگم صاحبہ ایک بات بولنے آئی ہوں"

چھوٹی بیگم نے واپس بولا۔

"کیا بات ہے ہاجرہ؟"

"اپنا چاچا مر گیا۔۔۔ یہ لڑکی اپن کی بھتیجی ہے۔ صرف باپ کا سہارا تھا سو وہ بھی اُٹھ گیا۔"

ہاجرہ نے اب سنجیدہ آواز میں کہا۔

"اب اس بیچاری کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ قدموں میں پڑے رہنے دیجیے۔ آپ کے چھوٹے چھوٹے کام کرے گی۔"

"کیا نام ہے اس کا"

لڑکی نے خود کہا۔

"شمع"

اس دن سے نواب غازی الدین کی حویلی میں شمع رہنے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اپنے کام سے شمع نے حویلی میں رہنے

والوں کا دل موہ لیا۔ چھوٹی بیگم کی نظرِ کرم شمع پر تھی۔ اس نظرِ کرم پر نوکروں کی پلٹن جلن سے مری جاتی تھی۔

بہار آتی تھی حویلی میں ایک نئی چہل پہل نظر آتی۔ نوکر اور نوکرانیاں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں پاندان کسی کے ہاتھ میں اُگالدان، کسی کے ہاتھ میں چھپر کھٹ نواب صاحب اپنے دوست عبد الصمد خان کے ساتھ ایک نیا شطرنج کا کھیل کھیلنے والے تھے۔ نوابی کوٹ پر آخری نظر ڈال کر اپنا عصا سنبھال لیا۔ راہداری میں دوڑتی ہوئی شمع سے ٹکر ہوئی۔ نواب صاحب کا عصا گر گیا۔

"ارے تو کلے کو اتنی بے سدھ دوڑی جا رہی ہو"

شمع کی زبان بند ہو گئی۔ شمع کا روپ بہار کے ساتھ کھل اُٹھا تھا۔ نواب اُس کا حُسن دیکھ کر دھنگ رہ گئے۔ اُس سے چند دن پہلے کی کمزور شمع نظر کے سامنے آ گئی۔ نواب کو شطرنج کا کھیل یاد آیا۔ اُس نے شمع سے کہا۔

"اب کاہے کو یہاں کھڑی ـــــ جا ـــــ جا"

شمع ڈرتی ہوئی نگاہوں سے چلی گئی۔ دوسرے دن بیگموں کو بہار کے آنے کی خوشی میں شہر کے بڑے باغ میں جانا تھا۔ فٹن تیار تھا۔ بیگموں کی تفا۔ آخری چیزوں کو فٹن میں رکھا رہی تھیں۔ چھوٹی بیگم نے اپنا غرارہ دیتے ہوئے شمع سے کہا۔

"لے آج پہنا آتی ہے نا ـــــــ پہن لے۔"

نہا کے جب چھوٹی بیگم کا دیا ہوا غرارہ شمع نے پہن لیا۔ تو کسی بیگم سے کم نظر نہیں آتی تھی۔ شمع نیا لباس چھوٹی بیگم کو دکھانا چاہتی تھی۔ لیکن جب وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو اُن کو نواب ملے۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن نواب کی آواز نے اُس کے پاؤں کو زنجیر پہنا دی۔

"ٹھہرو"

شمع گھبرائی ہوئی اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی۔ نواب نے باہر نظر دوڑائی چٹخنی لگائی اور شمع سے کہا۔

"اتنی خوبصورت تو چھوٹی بیگم بھی اس غرارہ میں نظر نہیں آتی۔"

لیکن بات صرف اس جملہ پر ختم نہیں ہوئی۔ بستر کی چادر پر شکن پڑ گئے۔ چٹخنی کھل گئی۔ چھوٹی بیگم نے شمع کے کھلے ہوئے بال بھی دیکھے۔ ہراساں بھی دیکھا۔ اُس دن شمع کہیں بھی نہ گئی۔ سر درد کا جھوٹ موٹ کا بہانہ بنایا۔ بیچاری بہل رہی تھی۔ لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ حویلی میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔

چھوٹی بیگم شمع کے بدلتے ہوئے عادتوں کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دن شمع دوڑتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی۔ واپس آکر بیگم نے کہا۔

"تیرے کو کیا ہوا ہے؟"

"ایکی آئی تھی۔" شمع نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"ایو ــــ تو ــــ پاشا کو بدنام کرتی پھرتی رہو گی۔
یہ سکینہ کہاں مر گئی ہے۔"

شمع نے دوڑ کر سکینہ کو لایا۔ سکینہ کو دیکھ کر چھوٹی بیگم
نے کہا۔

"دیکھ ــــ سکی ــــ اس کمبخت کو یہاں سے ہٹا لے۔"
شمع نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ایسی حالت میں، میں کہاں جاؤں۔"

"میرے کو نہیں معلوم" پھر کچھ سوچتے ہوئے چھوٹی بیگم نے
سکینہ سے کہا۔

"سکی تو اس کو میرے گاؤں کے پرانے مکان لے جا۔"

شمع اور سکینہ کے چلے جانے کے بعد پہلی بار اپنے آس پاس
کی گھٹن کو چھوٹی بیگم نے ختم پایا۔ نواب کو یہ خبر ملی کہ شمع چلی گئی
۔اس لئے وہ ایک مدت کے بعد چھوٹی بیگم کے پاس چلے آئے۔
ایک دن صبح ہی صبح بیگم نے نواب غازی الدین سے کہا۔

"ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہو ــــ کہو۔"

"میرا دل گاؤں جانا چاہتا ہے۔"

"کیوں — آج تم کو گاؤں کی یاد کیسے آئی"۔

"کہدوں" چھوٹی بیگم نے شرما کے کہا۔

اے — کیا — بات ہے"،

چھوٹی بیگم نے شرما کے کہا۔

"پھوٹے نواب"

"اے" نواب خوشی سے پھوٹ پڑے۔ "اب تک ہم سے چھپا رہی تھی — نہیں — نہیں۔ ایسا کر کے تم نے غلط کیا — جشن ہو گا۔"

جشن بھی ہوا — اور — پھر چھوٹی بیگم گاؤں بھی چلی گئی — ایک صبح گاؤں سے ایک آدمی آیا۔ اُس نے نواب سے کہا۔

"مبارک ہو نواب صاحب آپ کا بیٹا ہوا ہے۔"

اُس دن نہ پوچھو نواب کیا سے کیا کر بیٹھے — خیرات جشن مشاعرہ اور شطرنج کی کھیل کے بعد فٹن میں سوار گاؤں پہنچ گئے۔ بیٹے کو گود میں لیتے ہوئے نواب نے چھوٹی بیگم سے کہا۔

"چھوٹی بیگم اب تم بڑی بیگم ہو گئی ہو — بیٹا جو آیا"۔ چھوٹی بیگم کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ بیٹا نواب کا ہی تھا۔ لیکن چھوٹی بیگم اُس کی اصلی ماں نہیں تھی۔ اُس نے تو صرف اُس کو اُس لئے بیٹا

کہا تاکہ چھوٹی سے بڑی بیگم بن جائے۔

نجلی او نجلی

"نجلی — او — نجلی — میری پیاری نجلی — تو چھوٹی ہے مگر خوبصورت ہے۔ جب مجھے تیری یاد آتی ہے۔ تو سب کچھ یاد آتا ہے۔ تیرے سریلے اور میٹھے بول میری زندگی میں شہد گھول رہے تھے۔ تو مجھ سے کیوں روٹھ گئی۔ تو کہاں چلی گئی۔ تیرے لیے ہی تو میں نے زندگی کی خوشیوں سے منہ موڑا۔ ایک تو ہے جو مجھ سے روٹھ کے چلی گئی۔ یاد ہے نا — میری پیاری نجلی جب میں چھ سال کا تھا۔ میرے باپ نے تم کو میرے ہاتھ میں سونپ دیا۔ میں نے جب تم کو دیکھا تو میں خوشی سے چیخ پڑا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی یہ بھی سچ ہے۔ اسی دن میرا باپ مجھ سے جدا ہوا۔ لیکن پھر بھی میں خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ جب میں گاؤں کے سرسبز کھیتوں کو پار

کرتے ہوئے ناگری پہاڑ پر پہنچ گیا۔ یاد ہے نانجلی اونجلی
______ اُس وقت جب کہ تم کو اپنے مُنہ کے ساتھ لگایا۔
نہ جانے تم میں کیسے محبت بھرے پیار بھرے سریلے اور میٹھے بول
نکلنے شروع ہوئے۔ مجھے تم سے لگاؤ ہوا۔ میں تم کو اپنی زندگی
کا سرمایا تصور کرتا تھا۔ جب میرا باپ مجھے اس زندگی
میں اکیلا چھوڑ کے چلا گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں دنیا میں
بالکل اکیلا ہوں۔ تو نے میرے سارے غموں کو بھلا دیا ___ تو
میری زندگی کی خوشی کا راگ بن گئی ___ تو نے مجھے جینے کا اصول
سکھا لئے۔ اب میری زندگی کا سورج وہاں ہے جہاں غروب
ہونے میں تھوڑی دیر ہے۔ پھر تم مجھ سے کیوں روٹھ کے چلی
گئی ... نجلی اونجلی ... عمر کے اس حصے میں مجھ سے
اس طرح روٹھ کے جانا ٹھیک نہیں ہے۔ جہاں اتنے سالوں
سے ساتھ دیا۔ وہاں اور چند سال ساتھ دیتی تو میں اپنے
آپ کو زندگی کی اس آخری دوڑ میں اکیلا محسوس نہ کرتا۔ یہ
سچ ہے نجلی جب میں جوان تھا۔ تیرے مدھر سروں نے دوشیزاؤں
کے دلوں کو دھڑکنا سکھا لیا۔ اُن کی رگوں میں خون تیزی سے
گردش کرنے لگا تھا۔ لیکن نجلی نہ تو نے کبھی ان دوشیزاؤں کے
جذبات کی قدر دانی کی نہ میں نے کبھی ان کی طرف دیکھا ___ یہ
سچ ہے نجلی آج تک تو شہر کی بھیڑ میں نہ کھو گئی۔ پھر تو اچانک

کیوں غائب ہو گئی۔ تجلی او تجلی ــــ تیرے جانے کے بعد مجھے اپنی ساری زندگی کے واقعات کیوں یاد آتے ہیں ــ وہ بوڑھا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اپنے گھر لایا کھلایا پلایا۔ میری ذات اور جائداد کے بارے میں پوچھا۔ پھر ایک دن اُس بوڑھے آدمی کا ایک شخص میرے جھونپڑے میں گھس آیا تجلی تو اُس وقت میرے ساتھ تھی۔ وہ آدمی بوڑھے کے گھر سے رشتہ لایا تھا۔ میں نے منظور کیا۔ چند دنوں کے بعد میرے گھر میں تیسرا فرد بھی آ گیا۔ اس رات تجلی تم نے اس خوشی میں مادھر راگ الاپے۔ تو بہت عرصے تک یہ سمجھتی رہی کہ جس طرح تجھ کو میرے کھردرے ہاتھوں سے پیار ملے رہا ہے اسی طرح تم کو نرم و نازک ہاتھ تیرے ملائم جسم کو پیار کرینگے۔ لیکن وہ عورت تیری دشمن نکلی۔ تمہارے لئے اُس کے دل میں جلن پیدا ہوئی اور تم کو اپنی زندگی کا شریک سمجھنے لگی۔ اُس نے تم کو مجھ سے جدا کرنے کی کوشش کی۔

لیکن وہ بھول رہی تھی کہ میں سب کو بھول سکتا ہوں سب کو اپنے آپ سے جدا کر سکتا ہوں۔ لیکن تم کو میں کسی بھی حالت میں اپنے آپ سے دُور نہیں کر سکتا تھا۔ نہ جانے وہ عورت کیسی تھی! اُس نے مجھے کبھی پیار سے نہیں پوچھا۔ ہر وقت ڈانٹتی رہی ہر بات میں تیرا ذکر لے آتی تھی۔ میں صبح و شام جھگڑالو عورت سے

تنگ آگیا تھا۔ تم نے مجھ سے بار بار یہ التجا کی کہ میرا ساتھ چھوڑ دو۔
لیکن میں خود غرض اور احسان فراموش انسان نہیں بن سکتا تھا۔
میں سب کچھ بھول سکتا تھا۔ لیکن میں یہ کیسے بھول سکتا تھا کہ
تم نے مجھے زندگی کی ہر گھڑی میں میرا ساتھ دیا۔
ایک دفعہ اس جھگڑالو عورت نے تجھے ضرر پہنچانے کی کوشش
کی۔ میں نے اس عورت کے حوالے سب کچھ کیا۔ گاؤں کو چھوڑ
دیا۔ اُس جگہ کو چھوڑ دیا۔ جہاں میں نے اپنے کھیتوں کو اپنے
خون سے سینچا تھا۔۔۔۔ لیکن اے نجلی میں نے تجھ کو نہیں چھوڑا۔
میں در در کی خاک چھانتا رہا۔ شہروں شہروں۔ پھرفٹ
پاتھ سویا۔ لیکن تو ہر وقت میرے ساتھ رہی۔ تو نے ہر وقت
میرے غمناک دل کو فرحت اور تازگی بخشی۔ نجلی تو کہاں مرگئی۔
نجلی او نجلی۔۔۔۔ لیکن اس بوڑھے آدمی کی بات کوئی نہیں
سنا رہا تھا۔ وہ سڑک سڑک ڈھونڈتا رہا۔ "نجلی او
نجلی۔۔۔۔ "لیکن اس بوڑھے آدمی کی بات کوئی نہیں سنا رہا
تھا۔

پھر ایک راہ گیر لڑکے نے کہا۔
"بابا کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" کہا
"بیٹا میری نجلی۔۔۔!"
"وہ پرانی نجلی۔۔۔ بہت پرانی نجلی۔"

"ہاں وہی نخلی ——" بوڑھے کی آواز خوشی سے کانپنے لگی ——
لڑکے نے کہا۔
"اُس کو پانچویں گلی والے شیام نے اُٹھا لیا۔"
"بیٹا مجھے اُس کے پاس لے چلو۔"
"آؤ بابا۔"
وہ دونوں پانچویں گلی میں پہنچ گئے۔ لڑکا پکارنے لگا۔
"شیام —— او —— شیام —— ذرا اِدھر تو دیکھ۔"
شیام باہر آیا اُس کے پیچھے پیچھے ایک عورت تھی۔ شیام کے ہاتھ میں نخلی تھی۔ بوڑھا خوشی سے چیخ پڑا۔
"یہی تو میری نخلی ہے" لیکن عورت نے کہا۔ "یہ آپ کی نخلی ہرگز نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ نخلی تو میرے بیٹے کی ہے۔"
بوڑھا سب کچھ بھول سکتا ہے۔ لیکن اُس عورت کو نہیں بھول سکتا ہے۔ وہ اُس کی جھگڑالو بیوی تھی۔ بوڑھے نے افسردہ آواز میں کہا۔
"نہیں یہ میری نخلی نہیں ہے۔" بوڑھا یہ کہکر چل پڑا۔ لیکن بوڑھا چیخنا چاہتا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔
"نخلی او نخلی میری پیاری نخلی اب میرے پاس رہنے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں نخلی تجھکو شیام کے پاس ہی جانا تھا۔ نخلی کبھی تم کو میرے باپ نے مجھے سونپا تھا۔ وہ مرگیا تھا —— تو کیا،

احساس کی بجلی

میں مر گیا ہوں۔ میرے جذبات، احساسات اور خیالات مر گئے ہیں۔ مجھ میں جد و جہد کا جذبہ دم توڑ چکا ہے۔ جواں جواب دے گیا، صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے۔ میں زندہ ہوں لیکن پھر بھی مر گیا ہوں۔ مردہ آدمی کی طرح میری زندگی بھی بے حس، بے عمل اور بے رونق ہے۔ ایسے میں سوچتا ہوں۔

"میں مر گیا ہوں۔"

میری زندگی میں یہ جمود کیوں آگیا ہے؟ مجھ میں جذبۂ جہد کیوں بے حس ہو گیا ہے۔ مجھے کل یاد آیا جب مجھ میں زندہ رہنے کے لئے لاتعداد امنگیں موجود تھیں۔ جب میں ایک الہڑ عورت کو اپنی دنیا سمجھ رہا تھا۔ میں لہرایا:

"وہ تو میری مالا ہے۔"

"نہیں — نہیں — میں مرنا نہیں چاہتا ہوں — موت
مجھ تک جلد نہیں آ سکتی۔" اُس نے ایک تارے کو آسمان سے
گرتے ہوئے دیکھا وہ چیخ پڑا
"نہیں — نہیں — میں شیام سے وہ بچی چھین لونگا۔ میں
جینا چاہتا ہوں۔"

وہ دوڑنے لگا اور اس بھاگ دوڑ میں وہ ایک لاری سے
ٹکرا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کی لاش گندی سڑک پر پڑی
تھی۔

ختم

احساس کی بجلی

جب سے مر گیا ہوں، میرے جذبات، احساسات اور خیالات مر گئے ہیں۔ مجھ میں جد و جہد کا جذبہ دم توڑ چکا ہے۔ حوصلہ جواب دے گیا، صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے۔ میں زندہ ہوں لیکن پھر بھی مر گیا ہوں۔ مردہ آدمی کی طرح میری زندگی بھی بے حس، بے عمل اور بے رونق ہے۔ ایسے میں سوچتا ہوں۔

"میں مر گیا ہوں۔"

میری زندگی میں یہ جمود کیوں آ گیا ہے؟ مجھ میں جذبہ جد و جہد کیوں بے حس ہو گیا ہے۔ مجھے کل یاد آیا جب مجھ میں زندہ رہنے کے لیے لالچ اور امنگیں موجود تھیں۔ جب میں ایک لڑکی عورت کو اپنی دنیا سمجھ رہا تھا۔ میں بڑبڑایا:

"وہ تو میری ماں ہے۔"

— نہیں — نہیں ۔ میں مرنا نہیں چاہتا ہوں — موت اس قدر جلد نہیں آسکتی ۔" اُس نے ایک تارے کو آسمان سے گرتے ہوئے دیکھا وہ چیخ پڑا

"نہیں — نہیں ۔ میں شیام سے وہ بجلی چھین لونگا ۔ میں مرنا نہیں چاہتا ہوں ۔"

وہ دوڑنے لگا اور اس بھاگ دوڑ میں وہ ایک لاری سے ٹکرا گیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کی لاش گندی سڑک پر پڑی تھی ۔

ختم

احساس کی بجلی

جب میں مر گیا ہوں، میرے جذبات احساسات اور خیالات مر گئے ہیں۔ مجھ میں جد و جہد کا جذبہ دم توڑ چکا ہے جوان جواب دے گیا ہے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے۔ میں زندہ ہوں لیکن پھر بھی مر گیا ہوں مردہ آدمی کی طرح میری زندگی بھی بے حس بے عمل اور بے رونق ہے۔ ایسے میں سوچتا ہوں۔

"میں مر گیا ہوں۔"

میری زندگی میں یہ جمود کیوں آ گیا ہے؟ مجھ میں جذبہ جہد کیوں بے حس ہو گیا ہے۔ مجھے کل یاد آیا جب مجھ میں زندہ رہنے کے لئے لاتعداد امنگیں موجود تھیں۔ جب میں ایک بدصورت عورت کو اپنی دنیا سمجھ رہا تھا۔ میں بڑبڑایا؛

"وہ تو میری ماں ہے۔"

اس نے مجھے پالا پوسا اور ایک قوی ہیکل نوجوان میں تبدیل کیا۔ میں تو اُسے ماں سمجھ رہا تھا۔ میں نے جب سے آنکھ کھولی تو اس کو اپنا رفیق اور شفیق پایا۔ میں نے اس کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا۔ ماں باپ بھائی اور دوست بنایا اور وہ بھی میرے لئے سب کچھ بن گئی۔ اچانک ایک دن وہ یہ سب رشتے توڑ کے چلی گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ میں پکارتا رہا۔

"ماں ——— ماں ——— ماں"

میری پکار سے وہ واپس نہ آئی۔ میں بے سود پکارتا رہا یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس نے میری کمر توڑ دی تھی۔ میری زندگی کی تاروں میں اب ایک پرسوز نغمہ آکر مل گیا۔ لیکن پھر یہ نغمہ بھی بند ہوگیا۔ اس نغمے کا بھی گلا گھونٹ دیا گیا۔ جب مجھ سے یہ کہا گیا کہ بوڑھی میری ماں نہیں تھی۔ بوڑھی نے رحم کھا کے مجھے پالا پوسا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کسی نے میرا گلا گھونٹ دیا مجھے قتل کر دیا گیا۔ میرے جذبات احساسات خواہشات اور خیالات کا خون ہوگیا۔ میں مرگیا اور میں جیتا رہا۔

"ماں ——— ماں ——— تو نے مجھے زندہ کیوں رہنے دیا۔ میں زندہ ہو کے بھی مردہ ہوں۔ میرے لئے یہ زندگی اب وبال ہے"

زندگی میں پہلا سا جوش و خروش نہ رہا۔ وہ خوشی نہ رہی

تھی ۔ وہ آہنگ نہ تھی ۔ ہم تو بس یہی سمجھ رہے تھے کہ زندگی ایک بوجھ ہے اور اس بوجھ کو بہر حال اٹھانا تھا ۔ میں "رتن سنگھ فارم" میں بطور سیلزمین کام کر رہا تھا ۔ دن بھر لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا اور ہر ایک کو اپنی ہی الجھن میں مبتلا پاتا تھا ۔ یہاں تک کہ ہمارے مالک کو بھی الجھن تھی ۔ یوں تو اس کے پاس لاکھوں روپے تھے آسائش کے تمام سامان تھے ۔ اس کی زندگی مزے سے کٹ رہی تھی ۔ لیکن اس کو صرف ایک بیٹی تھی ۔ اس سے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس کے ہاں ایک بیٹا کیوں نہیں ہوا ۔ اور پھر اتنے بڑے کاروبار کو اس کے مرنے کے بعد کون سنبھال لے گا ۔ اس الجھن نے اس کے مزاج میں چڑچڑاپن لایا ۔ وہ اکثر معمولی معمولی باتوں پر اپنے ملازموں پر برس پڑتا اور ایک میں ہوں جو اتنے بڑے حادثے سے خود چار ہوا ۔ پھر بھی خاموشی سے سب کو دیکھتے جا رہا تھا ۔ مردہ ہو کر بھی زندگی کا بوجھ اٹھائے جا رہا تھا ۔

ایک دن مجھے ایک گاہک کو ایک چیز اس کے گھر پر دینی تھی ۔ میں نے گاہک کو چیز دی ۔ اس نے مجھے سو کے دس نوٹ دئے ۔ ہزار روپے کو جیب میں رکھ کے بس میں سوار ہوا اور واپس دوکان پر آگیا ۔ لیکن دوکان میں داخل ہوتے ہی مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میری جیب کٹ گئی ہے ۔ مجھے یہ

سکتہ طاری ہوگیا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں ڈرتا ہوا اپنے مالک کے پاس گیا۔ میں نے خوف بھری آواز میں کہا:

"مالک ہزار روپیہ گم ہو گیا۔"

سیٹھ رتن سنگھ مسکرا پڑا۔ اس مسکراہٹ میں گہرا طنز چھپا ہوا تھا۔ پھر اچانک سنجیدہ آواز میں بولا۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو اشوک ـــ کہاں رکھے وہ ہزار روپئے۔"

میں نے سچ بولتے ہوئے کہا:

"مالک میں سچ بول رہا ہوں۔"

"حرامی ـــ تو سچ اور جھوٹ کیا جانتے ہو؟" وہ چیخ پڑا۔

اس کے اس جملے نے میرے صبر و تحمل میں آگ لگا دی۔ میں نے کہا:

"سیٹھ یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔"

"آنکھیں دکھاتا ہے مجھے" سیٹھ غصے میں چیخ پڑا۔ "نکل جا ابھی میری دوکان سے حرامی۔ گیٹ آوٹ" میں حرامی کی آوازوں کے شور میں دوکان سے باہر آ گیا۔ انتقام کی ایک عجیب سی آگ نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں تڑپ رہا تھا۔ بار بار اپنے ہاتھوں کو مسل رہا تھا۔ جیسے یہ ہاتھ رتن سنگھ کی گردن کو مسل کے رکھ دینا چاہتے تھے۔ لیکن میں کچھ کر نہ سکا۔

یہ قسمت کی بات ہی تھی کہ مجھے ایک کالج میں کلرکی کی نوکری مل گئی۔ امتحانات ختم ہوتے ہی لڑکے اور لڑکیاں اب نئے کلاسوں کے فارم بھر رہے تھے۔ میرے ذمے ایم اے کے سال اول کے داخلہ فارم اور اُن کا فیس تھا۔ میں ایک لڑکی کا فارم Check کر رہا تھا۔ میری نظر اُس کے والد کے نام پر جم کے رہ گئی۔ اس کا والد سیٹھ رتن سنگھ تھا۔ میرے دل میں جذبۂ انتقام نے ایک کروٹ لے لی میں نے لڑکی کو بغور دیکھا جس کا نام بینا تھا اس کا رنگ گندمی تھا چہرہ کتابی تھا۔ بال نہایت لمبے اور کالے تھے۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

اس دن کے بعد میں اس لڑکی میں گہری دلچسپی لینے لگا۔ میں نے اس کے حرکات وسکنات پر کڑی نظر رکھدی۔ وہ سب سے الگ اور جدا رہتی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ کوئی گھل مل نہیں پاتا تھا۔ ایک دن میں نے اُس کو کالج کے میدان میں ایک تنہا قدآور درخت کے نیچے روتے ہوئے پایا۔ میں اُس کے پاس گیا۔ میں نے کہا:

"آپ روتی کیوں ہیں؟"

اس نے میری طرف خالی خالی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہہ دیا

"تو آپ مجھے یہ کہنے آئے ہیں کہ اب مجھے رونے پر بھی اختیار نہیں ہے۔"

"اُف آپ نے مجھے غلط سمجھ لیا۔"

"ہاں میں تو سب کو غلط سمجھ رہی ہوں ـــ کہو ـــ نا ـــ تو بھی میری ماں کی طرح کہ میں نے اپنے باپ کو غلط سمجھ لیا۔ میرے باپ کو یہ دکھ ہے کہ میں بیٹی بنکر کیوں آئی بیٹا بنکر کیوں نہیں آئی۔"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

"سیتا آپ پڑھی لکھی ہو۔ مت کسی کی بات پر کان دھرنا سیکھ لو۔ جینا اور پیار سیکھ لو۔"

سیتا نے دکھ بھری آواز میں کہا:

"لیکن کون مجھ سے پیار کرے گا۔ جس لڑکی کو اپنے باپ سے پیار نہیں ملا۔ اس کے ساتھ کون پیار کرے گا۔"

"تم احساس کمتری میں مبتلا ہوئی ہو۔" میں نے کہا:

"ایک بات بتاؤں ـــ خفا نہ ہو جاؤ گی۔"

"میں خفا نہیں ہونگی۔"

میں نے جرأت کرتے ہوئے کہا:

"سیتا میں تم سے پیار کرتا ہوں۔"

میرا یہ جملہ سنکے اس کی نگاہیں جھک گئی تھیں اور میں جان گیا کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ یوں تو میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن میرے دل کے اندر انتقام کی آگ موجزن تھی۔

سیتا کو پیار نہیں ملا تھا نفرت ملی تھی۔ وہ پیار کی بھوکی تھی (متلاشی تھی)۔ وہ پیار میں نے اس کو دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ

ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوگئے۔ اتنے قریب کہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ ہم کبھی جدا بھی ہونگے یا نہیں۔ وہ دن میں کیسے بھول جاؤں جب میرا انتقام پورا ہوا۔ جب سیتا نے اپنا سب کچھ میرے حوالے کیا اور میں نے ہنس ہنس کے اس کا سب کچھ لوٹ لیا اور لوٹ کے اپنی فتح کی داد دی۔ پھر آہستہ آہستہ میں سیتا سے دور ہو گیا۔ وقت کے ساتھ ہم دونوں کے تعلقات کٹ کے رہ گئے۔

ایک دن جب کالج سے لوٹ رہا تھا تو میں نے سیتا کو اپنے گھر کے دروازے پر پایا۔ میں نے کہا،

"تم"

"ہاں اشوک میں ہوں۔" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا

"کیوں آئی ہو؟"

"اشوک میں تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم بدل گئے۔ میں نے پیار کے نام پر اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کیا۔ لیکن تم بے وفا کیوں بن گئے۔ مجھے لوٹ کے جفا کا دامن کیوں تھام لیا۔ دیکھ میں آج اپنے ماں باپ کے گھر کو خیرباد کر کے آئی ہوں۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا؛

"سیتا میرے پاس تمہاری بہکی بہکی باتیں سننے کے لئے وقت نہیں ہے۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا ہوں۔"

سیتا غصے سے چیخ پڑی۔
"یہ تم کہہ رہے ہو اشوک ــــ تم ــــ اشوک میں ماں بننے والی ہوں۔"
میں خوشی سے قہقہہ لگا بیٹھا۔ میرا انتقام پورا ہوا تھا۔ میں چیخ پڑا:
"جا کر سیٹھ رتن سنگھ سے کہو کہ اس کی بیٹی کی کوکھ سے حرامی بچہ پیدا ہو رہا ہے۔ پھر دنیا کہے گی رتن سنگھ کا پوتا حرامی ہے ــ ہا ــ ہا ــ انتقام ــ"
میرے قہقہے کو محلے کے لنگڑے بابا نے خاموشی میں تبدیل کیا وہ کہہ اٹھا:
"کیوں ہنس رہے ہو اشوک ــــ شاید اسلئے ہنس رہے ہو کہ ایک حرامی بچہ مندر کی سیڑھیوں پر ملے گا۔"
میرے ذہن پر احساس کی بجلی گر پڑی تھی۔ دوسرے لمحے بابا نے سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو اپنے گھر کے اندر لا یا۔

بیکر زخمی

وہ ہار گیا

"ہنری"

"ہیلین"

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"تم نے پہلے بھی مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔"

"آج پھر کیوں بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہنری۔"

ہنری کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے شراب کا گلاس ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا:

"انگریزی شراب پی رہا ہوں۔ تمہارے ملک کی شراب ہے بہک جاؤں تو میرا قصور نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے ایک سیدھا سا سوال تم سے کیا تھا۔ لیکن تم اس سوال کو ایک الجھن میں تبدیل کیا۔"

ہیلن صوفے سے کھڑی ہوئی۔ اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا:
"ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے ایک سوال کو الجھن میں تبدیل کیا شاید اسلئے کہ میں تمہارے ملک کی سگریٹ پی رہی ہوں۔ لیکن چھوڑ دو ان باتوں کو تم اکثر فرانس میں کام کرتے ہو۔ میں انگلینڈ کے سفارت خانے میں ملازمت کرتی ہوں۔ میری اور تمہاری ملاقات اشوکا ہوٹل کے بار روم میں ہوئی یاد ہے تم کو" ہنری شراب کے پیگ غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے سارا انگلینڈ اس میں ڈوب گیا تھا۔ ہیلن نے کہا:
"تم چیزوں کو بہت جلد بھول جاتے ہو یہ تمہاری بری عادت ہے لیکن تم یہ نہ بھول گئے کہ تم اور میں دوسری بار کتب مینار کے باغ میں ملے۔ یہاں ہی تم نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں نے تمہاری محبت کو منظور کیا تھا۔ اس اقرار کی بنا پر ہم نے کشمیر آنے کا پروگرام بنایا۔ اسلئے تو ہم اس وقت جھیل ڈل کے ہاوس بوٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور آج تم مجھ سے یہ سوال کرتے ہو۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"
ہنری گہری سوچ میں ڈوب گیا اس نے شراب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا:
"شاید میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"
"شاید کیوں۔ کل ہی تم نے مجھ سے نشاط باغ میں زلفوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ تم مجھ سے شادی کرنے کیلئے تیار ہو۔"

ہنری نے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا:
"کل کی باتیں میں اکثر بھول جاتا ہوں۔ نہ جانے کیوں؟" ہنری نے آگے کہا:

"پھر کون کل کی باتیں یاد رکھتا ہے جس نے کل باتیں یاد رکھی وہ تو گم ہو جاتا ہے اپنے آپ میں کل جو میں نے تم سے کہا تھا وہ کل کی بات تھی آج میں سوچ رہا ہوں ـــــ کیوں نا ـــــ میں ایک کشمیری لڑکی سے شادی کروں۔ اُس کشمیری لڑکی سے جو لمبے گون جیسے کپڑوں میں اپنے خوبصورت جسم کو لپیٹے رکھتی ہے جس کا چہرہ غازے کی لمبی لمبی تہوں کے نیچے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ جس کے ہونٹ سرخ لپ سٹک کے نیچے اصل رنگ نہیں کھو بیٹھتے ہیں۔ جو کشمیری کلچر کی صحیح ترجمان ہے۔"

ہیلن نے اس بات پر یقین نہ کیا اسلئے اُس نے کہا:
"تمہیں تو مذاق کرنے میں کیا ہر وقت لطف ملتا ہے۔ میں جانتی ہوں تم باتیں بنانے میں ماہر ہو۔ پھر تو فرانس کے لوگ اِن ہی مذاقوں میں زندگی کے دن کاٹ لیتے ہیں۔"

"انگلستان کے لوگ ہر بات کو سیاسی انداز میں دیکھتے ہیں اور ہر بات کو سیاسی ہنر بازی سے جیت جانا چاہتے ہیں۔ لیکن میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ کسی بھی ہنر بازی سے تبدیل نہیں ہوگا۔"

ہیلن نے سگریٹ ایش ٹرے پر رکھا۔ اس نے گھمبیر آواز میں کہا:
"فرانس کے لوگ وعدوں کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن اچھا نہیں کرتے

ہیں۔"

"اچھا کون کرتا ہے۔ یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میرا دل ایک بلبل کی طرح ہے۔ جو باغ میں اسلئے کھو جاتا ہے کہ اس کو معلوم نہیں کس پھول کی ٹہنی کو اپنا سہارا بنالے۔"

ہنری نے کیمرہ گلے میں لٹکایا۔ ہیلین نے کہا:

"کہاں جا رہے ہو؟"

"وہ دیکھو" ہنری نے ڈل گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایلین سے کہا۔ "وہاں جو دوکانیں ہیں وہ کشمیری ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیزوں کو فروخت کرتے ہیں۔ آخر مجھے ایک کشمیری لڑکی سے شادی کرلی ہے مجھے ان چیزوں کے بارے میں معلومات فراہم ہونے چاہئیے۔"

ہنری ہاوس بوٹ سے باہر آکر ایک ٹیکسی شکارا میں سوار ہوا وہ فرانس کا رہنے والا تھا۔ جہاں کبھی نپولین بونا پارٹ حکومت کرتا تھا جس دھرتی پہ روسو اور والٹیئر نے جنم لیا۔ جس دھرتی نے ایک ایسا انقلاب دیکھا جس نے روایتوں کو چکنا چور کر کے رکھا۔ اسلئے تو ہنری ہر بات میں کوئی نکتہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہنری ایک دوکان میں داخل ہوا۔ دوکاندار نے کہا:

"حکم کیجئے آپ کو کیا چاہئیے؟"

"میں خود بھی کسی وقت یہ سوچتا ہوں کہ مجھے دراصل کیا چاہئیے۔ لیکن مجھے اب تک معلوم نہ ہوا کہ مجھے کیا چاہئیے؟"

"آپ کو وہ چاہیے جو دلکش ہو دلفریب ہو۔ یہ قالین دیکھیے حضور یوں تو اس کا اون آسٹریلیا سے آیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس قالین پر کشمیر چھایا ہوا ہے اس دلفریب ڈیزائن کو ہم نے شالیمار کا نام دیا ہے۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے کھو کر شالیمار کے باغ میں پہنچ جائیں۔ وہاں کے باغ کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک دیکھ آئیں۔ آپ کو وہاں یہی پھول ملینگے جو اس قالین کے ڈیزائن میں موجود ہیں۔ یہ اُس کشمیری کے ہاتھ کا بنا ہوا قالین ہے جو دن بھر صرف دو روپے کما لیتا ہے۔ جس کے گھر میں اب بھی افلاس منہ کھولے ہوئے ہے جو زندگی بھر قالین کے تاروں کو کھینچتے کھینچتے اپنی زندگی کی تاروں کو کھینچنا بھول جاتا ہے۔ یہ قالین امریکہ لندن پیرس آسٹریلیا یہاں تک دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے شاندار گھروں کی زینت بن جاتا ہے۔"

"تو پھر میں بھی ایک قالین خرید لوں گا۔ شالیمار کو میں اپنے ساتھ لوں گا۔ الگ رکھو اس قالین کو" منزی کے کہنے کے مطابق دوکاندار نے قالین کو الگ رکھا۔ اس دوکاندار کے ہاتھ میں اب کشمیری شال تھا اس نے کہا:

"حضور یہ کشمیری شال ہے۔ اس پشمینے کے شال کا اون لداخ سے آتا ہے پھر کشمیر کے لوگ اس اون کو کاٹ لیتے ہیں۔ پھر اس خیال سے ایک مصوّر کی طرح اپنے ہاتھوں سے نقش و نگار پھیلا دیتے ہیں

اس نقش و نگار میں حقیقی زندگی نظر آتی ہے۔"

"ہاں آتی ہے۔" ہنری نے شال کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا:

"اس شال پر بنے ہوئے پھول کشمیری لڑکیوں کی طرح ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ اُف کتنی محنت کرنی پڑتی ہو گی اس شال بننے والے کاریگر کو یہ شال بھی اپنے ساتھ لوں گا۔ اس شال کو بھی الگ رکھو۔"

اب دوکاندار کے ہاتھ میں پیپر معاشی کا گلدان تھا۔ دوکاندار نے کہا:

"یہ پیپر معاشی کا گلدان ہے اس پر جو انسانی ہاتھوں نے جانور بنائے ہوئے ہیں۔ یہ سب جانور کشمیری جنگلوں میں پائے جاتے ہیں وہ دیکھئے قدرت کے اس جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے عشق اور حسن ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے ہیں۔ وہ تمام عالم سے بے خبر ہیں۔ موٹا یز اکی طرح اس پیپر معاشی کے گلدان کی قیمت لاکھوں روپے نہیں۔ یہ گلدان تو صرف تین روپے میں ہے۔"

ہنری چونک پڑا۔ وہ بول اٹھا:

"اسقدر سستا۔ کیا ہوا ہے تم کشمیریوں کو جو اپنی چیزوں کو اس طرح اونے پونے داموں میں فروخت کرتے ہو۔ قدر کرو اپنے فن کی۔ میں اس گلدان کو بھی اپنے ساتھ لے رہا ہوں"۔ ہنری نے کہا "دوکاندار جانتے ہو میں ایک کشمیری لڑکی سے شادی کروں گا۔ وہ جب

اس کشمیری قالین پر بیٹھے گی اور یہ کشمیری شال اوڑھے گی۔ اپنے ہاتھوں سے اس پیپر ماشی کے گلدان میں پھولوں کو رکھے گی۔ تب مجھے محسوس ہو گا کہ سارا کشمیر میرے گھر میں سمٹ کر آیا ہے۔ دوکاندار میں ابھی تمہارے پیسے لے کر آؤں گا۔ میں کیسے ان چیزوں کو چھوڑ دوں۔ ہاں یہ سب چیزیں مجھے ہر حالت میں لینے ہیں۔"

"جلدی آجاؤ۔ کہیں کوئی دوسرا ان چیزوں کو نہ لے جائے۔"

"میں آتا ہوں۔ ابھی آتا ہوں۔"

ہنری دوڑتا ہوا شکارا میں سوار ہو گیا۔ ملاح نے اپنا چپو پانی میں ڈالا۔ شکارا مدھم رفتار کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ہنری نے شکارا والا سے کہا!

"تیز چلاؤ کہیں دیر نہ ہو جائے۔"

ٹھیک سی شکارا ہاوس بوٹ کے پاس رک گیا۔ ہیلن نے ہنری کو دیکھتے ہوئے کہا!

"اب تک تم کہاں رہ گئے تھے۔"

"میں کشمیر کی چیزیں خرید رہا تھا۔ اس کشمیری لڑکی کے لیے جس کے ساتھ میں شادی کروں گا اور ان چیزوں کو خریدنے کے لئے روپے لینے آیا ہوں۔"

"تم نے فیصلہ کیا کہ تم کشمیری لڑکی سے شادی کرو گے۔"

ہیلن نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ہنری نے اپنے سوٹ کیس سے پیسے

لنگاتے ہوئے کہا:

"اب اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے جلدی ہے اسلئے جلدی جا رہا ہوں۔"

ہیلن نے کچھ نہ کہا۔ وہ ہنری کو دیکھ رہی تھی جس میں نہ جانے کونسا جذبہ اُمنڈ آیا تھا۔ ہنری شکار میں سوار ہوا۔ ہیلن کو محسوس ہوا کہ ہنری اس سے بہت دور چلا گیا۔ لیکن ہنری ایک نئی خوشی میں سرشار تھا۔ وہ اس خوشی میں دوکاندار کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے دوکاندار سے کہا:

"میں نے پیسے لائے ہیں۔ میری من پسند چیزوں کو میرے حوالے کرو۔"

دوکاندار نے کہا:

"افسوس میں نے اُن کو فروخت کر لیا۔"

ہنری ہار گیا۔



جُوا

اُس نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ جوئے کو جس نے ہاتھ لگایا اس کی زندگی تباہ و برباد ہو گئی۔ وہ شوپیاں کے علاقے میں پیدا ہوا اور اسی علاقے میں پل کر وہ جوان ہوا تھا۔ اس سادہ لوح کسان نے بچپن سے جوانی تک کئی حادثات دیکھے۔ والد نے [illegible] کو دس سال کی عمر میں ہی کنال زمین حوالہ کر کے اس دنیا سے رخصت حاصل کی۔ والدہ نے اس کو بیوی کی ذمہ داریاں سونپ کے اس دنیا میں چھوڑا۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا تھا جیسے کہ چند گھنٹے پہلے ہوا تھا۔ وقت نے عقار کے کندھوں پر اس قدر ذمہ داریوں کا بوجھ لاد دیا تھا کہ اس کو گاؤں سے باہر کی دنیا دیکھنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے خود بھی باہر دنیا دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

آج بھی وہ صرف اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ ہانپتے

ہوئے وہ ایک ایسی خوشی محسوس کرتا تھا جیسے وہ کوئی مقدس کام انجام دیتا ہو۔ اناج اگانا تو مقدس کام ہی ہے۔ وہ تو صرف پیٹ کے لئے کھانا اگا سکتا تھا۔ اُس کے پاس تو اتنا ہی تھا۔ ہاں ایک خوشحالی گھر اس کے پاس ضرور تھا اور کیا چاہیئے اس کو اس کی بیوی ایک نیک بخت عورت تھی جس نے چار سال پہلے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ اس غریب کسان نے اپنے دل سے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ جب اس کا بچہ چار سال کا ہوگا تو وہ شہر جا کے حضرت بل درگاہ شریف کے آستان پر اکیس روپے نذرانہ عقیدت چڑھائے گا۔ اب تو بچہ چار سال کا ہوا تھا۔ اکیس روپے اس کے پاس نہیں تھے۔ ہاں اس نے اپنے گاؤں کے گناڈ شعبان کو گھر آنے کو کہا تھا۔ وہ اپنا بچا ہوا دھان گناڈ کو فروخت کر کے پچاس روپیہ حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ شہر کا رُخ کر سکے۔

وہ اب تک انہیں خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے دروازے کھولنے لگا۔ اس نے شعبان سے کہا:

"آؤ شعبان اندر آؤ"

تب تک اس کی بیگم نے حقہ تیار کر کے سامنے رکھا۔ شعبان نے تمباکو پیتے ہوئے غفار سے کہا:

"غفار کہا مجھے کیوں بلایا؟ خیریت تو ہے؟"

غفار نے بغیر کسی تکلفات کے کہا:

"شعبان مجھے ایک بھیڑ فروخت کرنا ہے۔"

"یوں تو میرے پاس بہت بھیڑیں ہیں۔ لیکن تم کو پیسوں کی ضرورت ہے۔ اسلئے تمہارا بھیڑ خریدنا پڑے گا۔ اچھا چلو بھیڑ کو دیکھ آئیں۔"

وہ دونوں اکھٹے مویشی خانے میں داخل ہوئے۔ اُس سے بھرے ہوئے کمرے میں وہ بیل تھے جو اُس کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ اس کی ایک گائے بھی یہاں تھی۔ جو اُس کے اکلوتے بیٹے کو اپنا سفید دودھ دے کر اُس میں نئی قوت بھر دیتی تھی اور ایک بھیڑ تھی جو وہ آج اپنے بیٹے کی چوتھی سالگرہ پہ قربان کر رہا تھا۔ شعبان نے بھیڑ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا:

"اس کا وزن زیادہ سے زیادہ چھ سیر ہوگا۔" ... جھوٹ بول رہا تھا لیکن نقا نے کہا:

"نہیں جو کچھ بھی ہے ٹھیک ہے۔"

"دیکھو بھائی میں اس بھیڑ کو تمہارے لئے ... روپے ... ہوں۔"

"کیا بتاتے ہو شعبان گنائی" اس نے حیرانی میں کہا۔ "یہ ... روپے کا بھیڑ ہے۔" شعبان نے بھیڑ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"میں زیادہ سے زیادہ بائیس روپے دے سکتا ہوں۔"

نقا چاہتا تھا کہ شعبان چند ... تبدیل کرے۔ لیکن

شعبان بھی اس بات پر تلا ہوا تھا کہ وہ اس بھیڑ کو چالیس روپے ہی میں خریدے گا بالآخر سودا چالیس میں ہی پٹ گیا۔ کیونکہ مجبور کو ایسے موقعوں پر جھک جانا ہی پڑتا ہے۔ جھک جانے کے سوا اس کا کام ہی کیا بن سکتا ہے۔ شعبان سے پیسے حاصل کرکے جب وہ اپنی جھونپڑی میں داخل ہوا تو اس کی بیوی نے کہا۔ "فروخت ہوا۔"

"ہاں"

"میں نے شہر جانے کیلئے تمہارے کپڑے تیار رکھے ہیں۔"

"اچھا دے دو"

اس نے سفید فرن پہن لیا۔ وہ لٹھے کا اصلی فرن تھا۔ سفید لٹھے کا شلوار بھی اس کے زیب تن ہوا۔ اس کی چادر تو اس کی بیوی نے پیارے پیارے ہاتھوں سے بنائی تھی۔ اور وہ چادر اس ہی بھیڑ کی اون سے بنائی گئی تھی جس کو غفار نے چند منٹ پہلے فروخت کیا وہ شہر جانے کے لئے تیار ہوا اس کی بیوی نے کہا:

"شہری بابو لگ رہے ہو۔"

"شہری بابو۔"

اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی جیسے اس کی یہ مسکراہٹ کہہ رہی تھی کہ شہری بابو بننا اسقدر آسان نہیں ہے۔

"کیا بن سکتے ہو کبھی تم شہری بابو۔"

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا نہیں یہ تو ایک خواب تھا یہ

ایک ایسا خواب تھا جو اس کو گمراہ کر سکتا ہے۔ اس کی بیوی ساجدہ نے اُس سے کہا:

"جاؤ خدا را تمہارا رکھوالا ہے۔ درگاہ شریف میں میرا سلام کہہ دینا۔"

غفار نے بیوی سے رخصت حاصل کی۔ جب وہ شوپیان کی سب سے بڑی سڑک پر چل رہا تھا تو ہر ایک کی نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا کہ غفار آج کیا بات ہے؟

ہاں کیا بات ہے؟

لیکن اس کی شاہانہ چال کسی کو کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ زندگی میں اس کو پہلی بار محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی شخصیت یکبارگی اہمیت کی حامل ہو گئی۔ یہی شاہانہ چال لیکر وہ گاڑی میں سوار ہوا۔ کنڈکٹر نے اس سے کہا:

"کہاں جانا ہے؟"

"شہر"

"دو روپے لگ جائیں گے۔"

"دو روپے!" اس کے لہجے میں حیرانگی کا جذبہ جھلک رہا تھا۔

"جی ہاں دو روپے ــــ حیران کیوں ہو رہے ہو۔"

انگریزی لباس میں ملبوس ایک آدمی نے کہا:

"شاید آج ہی نیند سے جاگ پڑا ہے۔"

سچ مچ دو روپے اس کے لئے ایک خاص قیمت رکھتے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ دو روپے دو روپے ہیں۔ لیکن اس کو شہر تک پہنچنے کیلئے اس کو دو روپیہ خرچ کرنے ہی پڑینگے۔ دو روپے چلے گئے تھے اب تو اس کے پاس صرف ۲۸ روپے رہ گئے تھے۔ ہر ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ اپنے آپ میں ایک نئی تبدیلی پا رہا تھا جیسے وہ پہلی بار زندگی سے آشنا ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایسی زندگی سے ہمکنار ہو رہا تھا جس میں صرف امید کے نغمے سنائی دے رہے تھے۔

امیراکدل کی اونچی اونچی عمارتوں نے اس کو حیرانگی کے سمندر میں ڈبو دیا۔ یہاں اس کو اپنے گاؤں کا کوئی گھاس کی جھونپڑی نظر نہیں آتی یہ تو سرینگر کا امیراکدل تھا۔ یہ تو بڈشاہ پل تھا۔ یہ امیراکدل یہ بڈشاہ پل یہی تو شہر ہے۔ یہاں پر رنگین ہوائیں لہراتے ہوئے۔ اس کو نئی تہذیب کا راگ سنا رہے تھے۔ انگریزی کپڑوں میں ملبوس ہر آدمی کیا ان اچھے کپڑوں میں کچھ پائے گا۔ ہاں ...... ہاں پائے گا...... معصومیت ...... سچائی، جھوٹ اور فریب کیا ہوتے ہیں وہ نہیں جانتا تھا۔

"حضرت بل درگاہ شریف کو کونسا راستہ جا رہا ہے۔"

لڑکے نے اپنے ہم جماعتوں کو جمع کر کے اُن سے کہا!

"دیکھو...... دیہاتی سا بڑا آدمی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ حضرت بل کونسا راستہ جا رہا ہے۔"

وہ سب اُن کے قہقہے لگانے لگے۔ غفار اپنے آپ کو دنیا کا بہت بڑا بیوقوف تصور کرنے لگا۔ سچ مچ اس کو اب تک گاؤں کے چار راستوں کے بغیر زندگی کا اور کوئی راستہ معلوم ہی نہ تھا۔ معلوم ہو بھی کیسے۔ جب اُس نے معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کیا یہ شہر والے ہر کسی کا استقبال ہنسی سے کرتے ہیں۔ کیا تک یہ ایسا کرتے رہیں گے۔ ان کو اپنا یہ رویہ تبدیل ہی کرنا پڑے گا۔

لیکن اس وقت اس کو درگاہ شریف حضرت بل جانا تھا اور اس کو خود ہی ایک راستے انتخاب کرنا تھا۔ آدمی کو تو زندگی میں خود ہی راستوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اگر وہ ان راستوں سے اِدھر اُدھر کھو ہی جاتے یہ تو اس کا اپنا قصور ہوتا ہے۔

ریزیڈنسی روڈ کی دوکانوں میں سجے ہوئے کشمیری تاجر کشمیر کے روشن مستقبل کی ضمانت دیتے تھے۔ ڈلگیٹ کا راستہ جھیل ڈل کی طرف جا رہا تھا حسین جھیل میں دلپذیر یادیں دفن تھیں — یوں تو یہ سب کچھ غفار کے لئے نیا تھا۔

وہ گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ مصنوعی چیزوں سے زیادہ قدرت کے نظاروں میں کھونے کا عادی تھا۔ جھیل ڈل تو اس کے لئے دلچسپی کا سامان بنا۔ وہ کھو گیا — قدرت کے حسین جھیل کی گہری خاموشی اور سکون میں۔ مگر کیفر کسی آواز نے اس کا سکون منتشر کیا۔

"دس کے بیس — بیس کے چالیس بناؤ۔"

جس آدمی کی یہ آواز تھی اس کے سامنے تین تاش کے پتے تھے
تاش کیا ہے؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اس کے دل نے کہا کہ یہی تو جوا ہے
فوراً اس کی زبان پر آ گیا۔

"یا خدا اِن لوگوں پر لعنت۔"

لیکن وہ آواز ہر لمحے کے بعد تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ تیز آوازیں اس کو ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیتی ہیں۔ وہ کھڑا ہوا۔ کس نے اس کے کان میں کہا:

"اگر دس کے بیس بن جائیں پھر بیس کے چالیس اور چالیس کے اسی ہوتے ہوئے سو تنکے رہ جائے۔"

تب!

تب وہ اپنی بیوی کے لئے چاندی کے اصلی پازیب خرید سکتا ہے ہاں وہ چاندی کے پازیب اس کی بیوی کے لئے باعث ہوں گے۔

ایمان ہاتھ سے جانے لگا۔

کیا ایمان آدمی کو اتنی جلدی اپنے ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔ ہاں آدمی اشرف المخلوقات ہے۔ کہ وہ اپنا ایمان بدل ڈالے۔ کوئی نہیں جانتا ہے۔ رات کی سیاہی پھیلنے لگی۔ ایسی سیاہی میں وہ بھول گیا کہ جوتے کو جس نے ہاتھ لگایا۔ وہ تباہ و برباد ہو گیا۔ وہ تو خود بھی اپنی تباہی پر تُلا ہوا تھا۔ اُس نے دس لگائے تو بیس واپس آئے۔ اس نے سوچا اگر بیس واپس آئے چالیس بھی واپس آسکتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "اگر میں چالیس لگاؤں تو کتنے واپس آئیں گے۔"

"اسّی"

"اسّی"

زندگی میں پہلی بار وہ کسی کے جھانسے میں آ گیا اور اس جھانسے میں آکر اُس نے چالیس روپے کھو دئے۔ چالیس چلے گئے تو کیا ہوا؟ ابھی تو اس کے پاس چادر تھی۔

"اپنی چادر داؤ پر لگا دو۔"

"نہیں ـــــ نہیں اس کو داؤ پر نہیں لگا سکتا ہوں۔ اس کو تو میری بیوی نے چھ مہینے کی سخت محنت کے بعد تیار کیا۔"

"قسمت بدل جائے گی۔"

اس کا ایمان پھر کشمکش میں پڑ گیا۔ اس کشمکش نے اس کی چادر پر لگا دی۔ چادر واپس نہ آئی۔ لیکن اس کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی جیسے اس کا سب کچھ لٹ گیا۔ اُس نے تو کسی کی امانت میں خیانت کی تھی۔ درگاہ شریف کے اکیس۲۱ روپے داؤ پر لگا دئے۔

"اکیس روپے"

وہ چیخ پڑا

"میرا بچہ"

اس کو محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کا گلا گھونٹ دیا اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اچانک وہ دوڑتا ہوا بٹہ مالو کے بس اڈہ پر واپس پہنچ گیا۔

نرس

میں نے جب اُس کو پہلی بار دیکھا تو اُس کے گورے چہرے میں کوئی خاص کشش نظر نہیں آئی۔ اُس کو میں نے پہلی بار امیراکدل کے بس سٹاپ پر دیکھا۔ وہ اُس وقت نرس کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ رعناواری ہسپتال میں ایک نرس کا کام کر رہی تھی۔ اس کا نام بیتا بی۔ عجیب سا نام تھا۔ یہ سب کچھ مجھے رعناواری کے اس دوکاندار سے معلوم ہوا جو اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ موت کے سوا اُس کو کسی اور کا انتظار نہ تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے شخصی راج کا وہ زمانہ بھی اُس کو یاد تھا جب وہ دن بھر کی کڑی محنت کے بعد صرف کچھ آنے کماتا تھا۔ اب زمانہ بدل گیا۔ زمانے کے دستور بدل گئے لیکن ماضی کی کچھ یادیں اب بھی اس کے پاس محفوظ تھیں۔ جب میں ایک

دن اس کی دوکان پر بیٹھا تھا تو ریتا میری کو دیکھکر اُس نے ایک لمبی سانس لی اور پھر کہا:

"زمانہ بدل جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسی کروٹ کھالیتا ہے کہ یقین نہیں آتا ہے کہ کل بھی زمانہ تھا۔" دیکھو ...... اس لڑکی کو دیکھتے ہو" اس نے ریتا میری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا! میں نے اقرار میں سر ہلایا بوڑھے نے تو ریتا میری کے بارے میں بہت کچھ کہا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ چوبیس سال کی لڑکی انگریزی ماں اور کشمیری باپ کی پیداوار تھی۔ اس کے باپ کا نام رائے بہادر سیٹھ موہن لال تھا۔ وہ شخص راج کا مانا ہوا رئیس تھا اسلام آباد، گاندربل اور سوپور میں اُس کے کھیت میلوں پر تھے۔ یہ سب کھیت تو اس کے حصے میں جاگیردارانہ نظام کی برکت سے آئے تھے۔ اُس لڑکی کی ماں کا نام لیڈی موہن ہیلن تھا موہن لال اور ہیلن کی شادی ۱۹۳۰ء میں ہوئی اور ۱۹۳۵ء میں ریتا میری پیدا ہوئی تھی۔ ریتا میری کو ریتا کا لفظ اپنے باپ سے ورثے میں ملا۔ زمانہ ہر لمحے کے بعد اپنی رفتار بدل دیتا ہے۔ نازوں سے پلی ہوئی ریتا میری کو کب یہ خیال آیا ہوگا کہ کل وہ ایک معمولی نرس بنکر رہ جائیگی۔ موہن نے جسطرح زمانے سے اپنا نقلی خطاب رائے بہادر حاصل کیا اور مہاراج کی خوشنودی سے چند کھیت کئے۔ زمانے کے تیور بدلنے کے ساتھ ہی وہ کھیت ہاتھوں ہاتھوں سے چلے گئے۔ موہن لال جیسے کمزور انسان کے لئے یہ ایک عظیم صدمہ تھا وہ اس صدمے کو برداشت نہ کرسکا

اور اس نے فانی دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت حاصل کیا۔ لیکن اُن دلوں پینتیس سال کی عورت تھی۔ یہ عورت اب بھی اس عمر میں جوان لگتی تھی۔ لیکن ایک عورت تھی جو مردوں کو انگلیوں پر نچاتی ہیں۔ وہ موہن سے زیادہ اس کی بڑی اسٹیٹ سے محبت کرتی تھی جب اسٹیٹ ہی چلی گئی تو اس کیلئے کیا رہ گیا تھا۔ جو وہ یہاں رہتی۔ لیکن موہن لال کی جو تھوڑی بہت جائداد باقی رہی تھی اس کو اونے پونے داموں میں فروخت کیا۔ بارہ سال کا رینا میری اس کے لئے ایک بوجھ تھی۔ جب کبھی اس کی نظر رینا میری پر پڑتی تھی۔ وہ بڑبڑاتی۔

"موہن لال نے مجھے اس بوجھ کے سوا اور دیا ہی کیا۔"

وہ لندن جانا چاہتی تھی۔ جہاں اب بھی نہ جانے کتنے نوجوان اس کا انتظار کرتے تھے۔ لندن سے اکیلی آئی تھی اور وہ لندن اکیلی واپس جانا چاہتی تھی۔

رینا میری کو اس نے موہن لال کے ایک رشتہ دار کے پاس یہ کہکر چھوڑ دیا:

"جب مجھے رہنے کے لئے معقول جگہ ملے گی تو میں رینا کو لندن بلاؤنگی"

لیکن بارہ سال ہوئے اب تک نہ اُس کی طرف سے کوئی پیغام آیا نہ اس نے کبھی رینا میری کو لندن بلایا اور اسطرح کل کی امیر زادی رینا میری ایک ہسپتال میں نرس ہو گئی۔

یہ تھی رینا میری کی کہانی جسکی وجہ سے میں اُس کے چہرے کو دیکھتا!

کے لیس سٹاپ پر دوسری بار غور سے دیکھنے لگا۔ نہ جانے اس کی نیلی آنکھوں میں مجھے کونسی گہرائی نظر آئی جس میں اپنے آپ کو ڈبو دینا چاہتا تھا کہ مجھے اپنے آپ کی بھی کچھ خبر نہ رہے۔ زندگی میں پہلی بار میں اسقدر جذباتی بن گیا۔ ہو سکتا ہے عشق کی دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن میری زبان ریتا میری کو کچھ کہنے کے لئے ساتھ نہیں دیتی تھی۔ میں نے تو زندگی کی دوڑ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر طے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ نہ جانے اس زبان کو کیا ہوا جو ریتا سے چار پانچ بار میرا کدل کے لیس سٹاپ پر چلنے کے بعد اتنا کہہ سکی۔

"آپ رعناواری ہسپتال میں کام کرتی ہیں۔"

"جی ہاں"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ لیکن میں نے آگے کہا:

"میں اکونٹس آفس میں کام کرتا ہوں۔ میرا نام رمیش ہے۔ تیس دن فائلوں میں سر کھپا کے صرف تین سو روپے ملتے ہیں۔ آپ کا کیا نام ہے؟"

"ریتا میری۔"

اُس نے مختصر سا جواب پھر دیا۔ نہ جانے کیوں اسقدر سرد مہری تھی۔ شاید حالات نے اس کو اس رنگ میں تبدیل کیا تھا لیکن میں اس کو بھولنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسلئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ریتا میری کو اپنا دل کا حال، جو میں اس کے سامنے بیان نہیں کر پاتا تھا۔ ایک خط کے ذریعے بیان کروں گا۔

پیاری رنجنا جی

میں تمہارے لئے کوئی اجنبی نہیں ہوں۔ امیرا کدل کے بس سٹاپ پر ہم ایک دوسرے کو چار پانچ بار ملے۔ میں وہی رمیش ہوں جو اکونٹس آفس میں کام کرتا ہے۔ میری!

میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ بہت دنوں سے میں یہ بات تم سے کہنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ مگر میری زبان تمہارے سامنے یہ بات کہنے کے لئے ساتھ نہیں دیتی تھی۔

آج میں اس بات کو کہنے کے لئے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میری جان! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ تم اس غریب نوجوان کی محبت کو قبول کرو گی اور میرا ہمسفر بن کر ہم دونوں زندگی کی یہ دوڑ اکٹھے طے کریں گے۔ میں نشاط باغ میں پھوارے کے پاس گیارہ بجے صبح سے شام کے چھ بجے تک انتظار کروں گا۔ اُمید ہے کہ تم آجاؤ گی۔

تمہارا صرف تمہارا

رمیش

پھوارے تک آنے تک ایک ایک لمحہ میرے لئے ایک ایک سال کے برابر بن گیا۔ اتوار کا دن مجھے منحوس ہوا۔ نشاط باغ کی رنگین فضائیں مست کر رہی تھیں۔ اس کے فوارے میرے دل کو محبت کا ایک نیا راگ سنا رہے تھے۔ شاید نشاط باغ بہاروں میں شوخ چھپا گئی

تھی کیونکہ میری ریتا آنے والی تھی۔ آخر ـــــ آخر ریتا میری آ گئی ریتا کا چہرہ پہلے سے بڑی سنجیدہ تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ایسی کوئی چمک نہ تھی جو مجھے ڈوب جانے کے لئے کہے۔ میں نے کہا:

"میرا پیار آ گیا۔"

ریتا نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"نوجوان تم غلط سوچ رہے ہو مجھے اپنے خوابوں میں تحلیل نہ کرو۔ میرے ساتھ اپنی زندگی کے حسین خواب مت جوڑو۔ تمہارا اور میرا راستہ الگ الگ ہے۔ یہ راستے کہیں کبھی نہیں ملینگے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے کہا:

"کیوں؟ ـــــ تم کیوں چونک پڑے" ریتا میری نے سنجیدہ آواز میں کہا۔ "رملیش، گورے نوجوان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں لندن میں شادی کرنا چاہتی ہوں اس ملک سے دور بہت دور اپنی بستی بسانا چاہتی ہوں۔ اس ملک کے لوگ بہت جلد یہ بھول گئے کہ میں ایک رئیس کی بیٹی تھی۔"

"نہیں میری۔" میں نے کہا۔ "تمہیں تو دراصل تمہاری ماں بھول گئی۔"

"مجھے تو سب ہی بھول گئے۔" وہ غصہ میں چیخ پڑی۔ "میں لندن جاؤں گی اور جاؤں گی۔"

وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ مگر وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ زمانے کے دیے ہوئے زخم اُسے کہلوا رہے تھے۔

زندگی میرے لیے بے لطف ہو گئی۔ میرے لیے تو زندگی میں اب کوئی مزا نہ رہا جس کو چاہا اور دل کی دنیا میں بسا لیا تھا وہ تو اتنی دور چلی گئی تھی کہ اب اُس کے واپس آنے کی کوئی اُمید ہی نہ تھی میرے دوست اکثر مجھ کو کہتے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔"

سکون حاصل کرنے کے لیے ایک ستار خرید لیا۔ ستار کے مدھر راگ تھوڑی دیر کیلئے من کو بہلاتے تھے۔ ایک دن ستار بجاتے بجاتے نہ جانے کتنی دور چلا گیا۔ میں آنکھیں بند کئے ہوئے من کی دنیا میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب میں واپس آیا تو اپنے سامنے ریتا میری کو پایا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ وہ حقیقت میں ریتا میری ہی تھی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میں کوئی حسین خواب دیکھ رہا تھا لیکن اُس کی آواز نے میرے خیالات منتشر کئے

"اچھا ستار بجاتے ہو۔"

"شکریہ" میں نے کہا "تم یہاں کیسے آئی ہو۔"

"میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ میری ماں نے لندن آنے کیلئے ایک ہزار پونڈ سفر خرچ بھیج دیا ہے۔"

میں نے تلخ آواز میں کہا۔ "کیا تم مجھ سے یہ کہنے آئی ہو کہ تم لندن جا رہی ہو۔"

ریتا میری نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے ماں کو ایک ہزار پونڈ کا روانہ کیا ہوا چیک واپس بھیج دیا اور میں نے لندن جانے کا فیصلہ ترک کیا ہے۔ میں تو اب تمہارے پاس آئی ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے گھر میں جگہ دو گے۔"

میں اسکو حیران کن نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

طوفان

ڈونگہ بابا ڈیمب کے گھاٹ کو چھوڑ کر نجہ بل کی طرف روانہ ہوا ملاح کی رنگین آواز فضاؤں میں بکھر گئی۔ وہ ایک کشمیری گیت گانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد ڈونگہ نجہ بل کے گھاٹ کے سامنے کھڑا ہوا۔ ڈونگے آنے کے بعد دو آدمیوں نے قالین کھانے کا سامان اور بستر لایا۔ آنے والے آدمیوں میں سے ایک آدمی نے ملاح سے کہا:

"غفار اگر ہم یہاں سے دن کے چار بجے روانہ ہونگے تو ہم نرت بل کتنے بجے پہنچ جائیں گے۔"

"رات کے گیارہ بجے تک تو پہنچ جائیں گے۔ اب آپ لوگ بہت جلد آجائیے۔"

"تھوڑی دیر میں سب ہی آجائیں گے۔"

یہ کہکر وہ دونوں واپس چلے گئے۔ ملاّ غفار کی عمر تیس برس تھی

والدین نے اپنے پیچھے غفار کے لئے ایک ڈونگہ چھوڑ دیا تھا۔ جس کی چھت کو مرمت کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن اس کام کے لئے اس کو دو تین سو روپے درکار تھے۔ جو اب تک وہ حاصل نہ کر سکا۔ اس بار امید تھی کہ ان خریداروں سے اس کو دو تین سو روپے کی رقم مل جائے گی۔ دو سال پہلے اس کی شادی اپنے چاچا کی بیٹی زینب سے ہوئی تھی۔ لیکن اس کے یہاں اب تک کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ زینب سوچ رہی تھی کہ درگاہ شریف میں بطور نیاز کچھ رقم دے گی تو اس کے یہاں بچہ پیدا ہوگا۔ باورچی آئے گا۔ لیکن اس آدمی کا چہرہ اٹکا ہوا تھا۔ غفار نے کہا:

"صمد شاہ خیریت تو ہے۔"

"صمد شاہ خیریت تو ہے۔" اس نے دوسری بار جملہ دہرایا۔

"بھئی ان لوگوں نے ڈل آنے کے لئے مجبور کیا۔ میرا بیٹا سخت بیمار ہے۔ میں اس کو اس حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اب خدا ہی خیر کرے۔"

"ہاں خدا خیر کرے۔"

صمد شاہ شہر کا مشہور لذیذ کھانا بنانے والا آدمی تھا۔ اس کو لذیذ کھانا بنانے میں درجہ اول کا سرٹیفکیٹ ملا تھا۔

چار بجے آدمیوں کا ایک گروہ نہرو پارک گھاٹ پر آگیا۔ گروہ کے آگے آگے چالیس سال کی عمر کا ایک آدمی تھا۔ اس . . . .

آدمی کا نام محمد عثمان تھا۔ وہ ایک سکول ہیڈ ماسٹر تھا۔ ہیڈ ماسٹر کی اب تک شادی نہ ہوئی تھی۔ ہیڈ ماسٹر نے ایک اُستانی کے آنکھ لڑائی۔ دو تین دن اکٹھے نشاط اور شالیمار میں عہد و پیمان کے لمبے چوڑے وعدے کئے۔ لیکن اُستانی ہیڈ ماسٹر کو چھوڑ کر ایک امیرزادے سے شادی کی تھی۔ ہیڈ ماسٹر نے کسی بھی عورت کو اپنے قریب نہ کرنے کی قسم کھائی۔ شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اب تو صرف اُس کو سکول کی معمولی معمولی باتوں کی فکر رہتی تھی۔

ہیڈ ماسٹر نے ڈف نگے میں تشریف رکھتے ہوئے کہا:

"مجھے ذرا اس بات کا ہے کہیں وہ ماسٹر سلام لڑکوں کو کتنی نہ دے بخدا کام چور آدمی ہے۔"

ان ہی میں سے ایک آدمی نے جس کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس سال تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کہنے لگا۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب اس وقت سکول کی باتوں کو بھول جائیے۔"

نوجوان آدمی کا نام رندھیر تھا۔ رندھیر نے دو مہینے پہلے ایم۔اے۔ فائنل کا امتحان دیا تھا۔ وہ غریب والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ غریب والدین کو اُمید تھی کہ اگر بیٹا امتحان میں پاس ہوا تو کسی مقامی کالج میں لیکچرار بن جائے گا۔ رندھیر بھی چاہتا تھا کہ وہ بھی بوڑھے ماں باپ کے کسی کام آئے۔ ہیڈ ماسٹر نے رندھیر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

"رندھیر کہاں کھو گئے؟ شاید تمہیں رزلٹ کی فکر لاحق ہے۔ فیل اگر

کوئی ہوگا تو میں وہ ہوں گا۔ تم ضرور پاس ہو جاؤگے۔"

ہیڈ ماسٹر زندہ دل آدمی تھی۔ اسی زندہ دلی کی وجہ سے وہ بہت جلد ہر مجلس میں چھا جاتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی یہ باتیں سنکر سب ہی لوگ ہنس پڑے۔ ملہ غفار نے اپنے ڈونگے کا رخ جھیل ڈل کی طرف کیا۔ ہیڈ ماسٹر کے گھر ملو لوکر عبداللہ نے اُن کے سامنے چائے کی پیالیاں رکھیں۔ عبداللہ شوپیاں کا رہنے والا تھا۔ گذشتہ سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے کھیت اچھی فصل نہ اُگا سکے تھے اسلئے وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس تیس روپے والی نوکری کرنے لگا ان ہی تیس روپیوں سے اس کے گھر کے تین افراد اپنا پیٹ بھر لیتے تھے ہیڈ ماسٹر ڈل کی سیر کو نکلا۔ اسلئے وہ اپنے گاؤں آج تنخواہ روانہ نہ کر سکا۔ چائے پینے کے بعد ہیڈ ماسٹر نے عبداللہ سے کہا؛

"عبداللہ ذرا تاش ادھر لاؤ۔"

تاش آگیا۔ وہ تاش بانٹنے لگا۔ فلاش کا پہلا راؤنڈ ختم ہوا۔ ہیڈ ماسٹر نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا؛

"قیوم تم اس جوئے میں بھی تجارت کی ہیرا پھیریاں چلاتے ہو اسلئے تم ہر وقت جیتتے ہو۔"

قیوم قالینوں کا ایک مشہور تاجر تھا۔ قیوم سنز کا نام کشمیر میں آنے والے ہر بیرونی سیاح کی زبان پر ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ مجال تھا

کوئی سیاح قالین خریدے بغیر اس کی دوکان سے باہر نکلے جوا کھیلنے میں بھی قیوم ماہر مانا جاتا تھا اس وقت اس کے ہاتھ میں تین بادشاہ تھے اور قیوم اُس آدمی سے کہنے لگا۔

"احمد شاہ آگے بڑھو" احمد شاہ نے کانپتے ہوئے میدان میں دس روپے ڈالکے کہا "شو"

قیوم نے تین بادشاہ ترتیب کے ساتھ اس کے سامنے رکھے قیوم نے روپیوں کو سمیٹتے ہوئے احمد شاہ سے کہا!

"کیوں بھئی احمد شاہ سوناہار نے وہ چوڑیاں تیار ہوئیں کیں۔"

"ابھی تیار نہیں ہوئیں۔ لیکن دینے کو وعدہ کیا ہے۔ مجھے کل چار چناری سے شہر دو تین گھنٹے جانا ہی پڑے گا۔"

احمد شاہ نے جب بی اے پاس کیا تو وہ نوکری ڈھونڈنے نکلا ایک دفتر سے دوسرے دوسرے سے تیسرے دفتر جاتا رہا۔ لیکن سب جگہ ایک ہی جواب ملا "No vacancy"

مایوس ہو کر اس نے ایک غیر سرکاری کارخانے کا رُخ کیا۔ یہاں پر اُس کو ایک سو روپے کی نوکری ملی۔ اس کی ایک ہی بہن تھی۔ دو چار مہینے پہلے اُس نے اس کی منگنی کی تھی۔ بیچارے نے دو تین سال کی محنت کے بعد کچھ پیسے جمع کیے تھے اور اُن پیسوں سے بہن کے لیے جھکن زیور اُن بنا رہا تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ صدیقہ چیخ پڑا۔

"اے بھائی احمد شاہ کھانا تیار ہوا۔" اُس نے واپس جواب

دیا۔" ابھی تھوڑی لگ جائے گی۔

"اُف ۔ ۔ ۔ ۔ اُف پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔" صدیق نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا! سب لوگ یہ سنکر ہنس پڑے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے رہا نہ گیا۔ اس نے کہا:

"صدیق تمہیں تو ہر جگہ پیٹ کی فکر رہتی ہے۔"

"کریں کیا؟ آدمی تو سب کچھ پیٹ کے لئے ہی تو کرتا ہے۔"

"خاص کر تم"

اس پر وہ سب دوبارہ ہنس پڑے۔ صدیق کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اُس نے سیر و تفریح اور پیٹ کے سوا کچھ حاصل ہی نہ کیا تھا۔ لیکن اس کو کام کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اس کے پاس آبائی میراث کیا کچھ کم تھا۔ شوپیاں کے علاقے میں اس کا دو سو کنال لمبا کھیت تھا۔ رندھیر نے تاش کے پتے کو اٹھاتے ہوئے کہا:

"صدیق میں نے سنا ہے کہ سرکار زمینداروں سے بہت جلد زمین لے رہی ہے۔" صدیق نے سنجیدہ آواز میں کہا:

"یہی فکر تو مجھے آجکل لاحق ہے کہ کہیں سچ مچ سرکار زمین کاشت کرنے والوں کو نہ دے اسلئے تو مجھے آجکل بہت جلد بھوک لگتی ہے۔"

احمد شاہ نے کھانا تیار کیا۔ کھانا لگ گیا۔ چونکہ اس وقت

ڈل، کٹوال میں تھا۔ سب ہی کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ رنلدھیر نے گوشت کا ایک ٹکڑے کو منہ میں ڈالتے ہوئے کہا؛

"بہتر یہ ہے کہ رات بھر چار چناری میں گذار دیں۔ وہاں پر باتھ روم بھی ہیں۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا؛

"میرا خیال تھا کہ ہم نشاط باغ جائیں گے۔ لیکن بہتر ہی رہے گا کہ رات بھر چار چناری پر ہی بسر کریں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" قیوم نے ہیڈ ماسٹر کی بات کی تائید کرتے ہوئے ڈونگے کی کھڑکی سے آسمان کی طرف نظر ڈالی اور کہا؛

"لیکن آسمان پر بادل پھیل رہے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں بارش نہ آجائے۔ اسلئے تمھارے کہو کہ جلدی ڈونگے کو چار چناری پر لے جائے۔"

پھر اچانک بادل تیزی سے گرجنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ قدرت زمین کا دل ہلانے پر آمادہ تھی۔ اُن کا ڈونگہ جھیل ڈل کے بیچ میں تھا۔ بارش بھی آگئی۔ پھر اچانک ایسی ہوا شروع ہوئی کہ سب کی زبان سے اکٹھے نکلا۔

"طوفان"

یہ ایسا طوفان ہوتا ہے جو ہر بار اپنی گود میں کئی زندگیوں کو ہڑپ کر لیتا ہے۔ ڈونگے میں سب بیٹھے ہوئے آدمیوں کے

چہروں کا رنگ فق ہوا تھا جیسے زندگی اُن کے ہاتھ سے چلی گئی تھی۔ لیکن ایسے میں بھی احمد شاہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے صبح بہن کے لئے چوڑیاں دیکھنے جانا تھا۔ لیکن صبح تک نہ جانے کیا حال ہوگا؟" رندھیر نے گھبراتے ہوئے کہا:

"تمہیں تو سونے کی چوڑیاں کا غم پڑا ہے۔ چوڑیاں تو آ ہی جائینگی لیکن میں ایم اے میں پاس ہوں یا فیل ہوں۔ یہ کون بتاوے گا۔"

ہیڈ ماسٹر نے رندھیر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

"رندھیر کیا ہوا تمہیں؟ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ طوفان خود بخود ٹل جائے گا۔ لیکن مجھے فکر اس بات کی ہے کہ کہیں سکول کے چپراسی نے سکول کے کمروں کی کھڑکیاں کھلی نہ رکھی ہوں ان کے شیشے ٹوٹ جائیں گے۔"

صدیق کا قہقہہ اس طوفان میں بھیانک بن گیا۔ اُس نے کہا:

"تم سب ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے سوچ رہے ہو ارے میرا حال دیکھو میری تو ساری چک داری جا رہی ہے۔" قیوم کے ہاتھ میں تاش کے تین پتے تھے۔ اُس نے کہا!

"ارے بھئی تم بہت دور کی سوچتے ہو۔ میرے ہاتھ میں تین یکے ہیں۔ کون ہے جو ان کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہتا ہے بڑا دھوکے باز یہ طوفان بھی نکلا۔ میری اچھی خاصی رقم ڈبو دی۔"

عبداللہ کانپتے ہوئے باورچی خانے میں داخل ہوا۔ وہ سہمی ہوئی

آواز میں صمد شاہ کہنے لگا۔

"اب طوفان تھمے گا بھی یا نہیں۔ مجھے تو کل صبح شالیمار کے ڈاکخانے سے گھر تنخواہ کے روپے روانہ کرنے تھے۔"

صمد شاہ نے سنجیدہ آواز میں کہا:

"عبداللہ تمہیں گھر تنخواہ روانہ کرنے کی فکر پڑی ہوئی ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ میرے بیٹے کا کیا حال ہوگا۔ جو کل سے بیمار پڑا ہے۔"

غفّار کی بیوی زینب کے ہاتھ میں لمبا چوغا تھا۔ وہ بڑبڑائی۔

مجھے درگاہ میں نیاز چڑھانا ہے۔ تب ہی میرے گھر میں اولاد آئے گی۔"

غفار اپنے ڈونگے کا چھت دیکھ کر کہنے لگا۔

"لگتا ہے اس طوفان کے ساتھ میری زو تین سو روپے کی رقم ڈوب جائے گی اور میں اس سال بھی ڈونگے کے چھت کی مرمت نہیں کرسکونگا۔"

لیکن اس طوفان! — میں بھی کتنے خیالات کا طوفان!!



گھاس کا تنکا

'بہت اونچا کھڑا ہوں۔'

میں نے لمبی سانس لی اونچائی کو دیکھکر خوف سا لگتا تھا وہ خوف جو طبیعت میں کمزوری لانے کا باعث بن جاتا ہے۔ جو ر بار بلندی کے ایک اونچے مکان پر کھڑا ہو کے فوراً میرے دماغ میں یہ خیال آگیا۔

'کیوں نا میں یہاں سے کود جاؤں ـــــ پھر میرے جسم کا چکنا چور ہو کے حلیہ بگڑ جائے گا۔'

لیکن کیوں یہ خیال میرے دماغ میں آیا۔ کیسے آیا کیونکر آیا... اور کیونکر اس انوکھے خیال سے مجھے چھٹکارا ملیگا۔ کیا میں زندگی کی بے ربط جدوجہد سے تنگ آگیا ہوں۔ تنگ اور سخت زندگی سے ہمیشہ آدمی عاجز آجاتا ہے ـــــ اور عاجز انسان اس منتشر دماغ سے چھٹکارا پانے کے لئے دل کہیں اور الجھ جاتا ہے۔ تب میری نظر جاتی ہوئی سڑک

پر اسکرٹ لگائی ہوئی دوشیزہ پر پڑی۔ وہ دوشیزہ جس کا شباب بقیہ کپڑوں میں پھوٹ پھوٹ کر یہ تقاضہ کر رہا تھا۔

"اُتار لو میرے یہ کپڑے بھی چھٹکارا دلا دو مجھے میرے ان کپڑوں سے۔ میرا حُسن بے باک ہو کر نظر شوق سے داد وصول کرنا چاہتا ہے"۔

یہ کل کی عورت نہیں جو چلمن سے باہر اپنا چہرہ بھی نکال لینے کو گناہ سمجھتی تھی۔ ایک ایسا گناہ جو قتل کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ قدریں بدل رہی ہیں۔

قدروں کے ساتھ انسان بدل رہے ہیں۔ تقاضے بدل رہے ہیں اور یہی نئے تقاضے آج کی عورت سے برہنہ ہو جانے کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ اس کی مخالف جنس اس بات کے لئے عورت کا احساس جھنجھوڑتی ہے۔ سماج کے بدلے ہوئے اصول ہر انسان کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ نئی قدروں نئے اصولوں اور نئے تقاضوں کو اپنا لے ۔۔۔ ایسے تقاضے ۔۔۔ ایسے اصول ۔۔۔ جو چیخ چیخ کر میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ لیکن میں نئے تقاضے اور نئے اصولوں کی اُلجھنوں میں کیوں پڑا ہوں۔ ایسے اصول اور ایسے تقاضے کہاں مجھے ذہنی کوفت سے نجات دلائیں گے۔ یہ کوفت ہی مجھ میں کیوں پیدا ہوئی۔ دراصل اونچے اور

قد آور مکان کو منتشر کر دیتے ہیں اور منتشر دماغ کو سکون بخش دینے کے لئے ہرگز یہ جگہ نہیں تھی۔ جہاں سے انسان کیڑوں کو برابر لگتے تھے ــــ کیڑے ــــ اور انسان کا یہ تصور زندگی کے لئے بار گراں ثابت ہوتا ہے۔ اس بوجھ سے نجات دلانے کے لئے میرا ذہن کسی چیز کی تلاش کر رہا تھا۔ ہاں اندھیروں میں نظر آیا ــــ سرکاری کھمبا۔ بجلی کے لیمپ دھیمی دھیمی روشنی آس پاس پھیلا کر کوئی تصویر پیش کر رہے تھے۔ میں چیخ پڑا۔ "نہیں وہ تصویر نہیں تھی" وہ انسان تھا ــــ ایک انسان۔ جو سرکاری روشنی میں مستقبل کے دھاگوں سے کچھ بُن رہا تھا۔ وہ کتاب کے ہر لفظ میں کھو کر کچھ پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سنہرے مستقبل کے جنتر میں قدرت کی دی ہوئی روشنی کو اندھیروں میں مُبدل کر رہا تھا۔ پھر وہ کل کسی دفتر میں کلرک بن جائے گا۔ کلرک بن ہی جائے گا ــــ اور پھر اُس سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

مستقبل کے تلاش میں میرے دوست بجلی کے اس کھمبے کے نیچے تمہیں تمہارا سنہرا مستقبل نہیں ملے گا۔ اُس دھیمی دھیمی روشنی کے ساتھ بھاتک اندھیرا ملے گا۔ میں چیخ پڑوں گا ہاں میں چیخ پڑوں گا۔ "چھوڑ دو اس کھمبے کو ــــ آؤ ــــ

میرے پاس۔ اتنے اونچے آجاؤ۔ یہاں سے تم اشوکا ہوٹل کی دیو ہیکر عمارت دیکھ لو گے۔ ماضی کا لال قلعہ اور قطب مینار دیکھ لو گے۔ اونچی اونچی عمارتوں کے ساتھ زنگ بڑھتی زندگی کی جھلکیاں دیکھ لو گے۔ "چھوڑ دو" میں اپنے بازوؤں کو پھیلا کر اس کو دعوت دیتا ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہوا وہ مجھے وہیں سے کہہ رہا تھا۔

"نیچے آجاؤ۔ ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے ۔۔۔ مجھے سنہرے مستقبل کا جھانسہ دیکر مجھ سے میرا ایمان میرا نصب العین اور میری زندگی چھین لینا چاہتے ہو۔ ان اونچی عمارتوں میں گناہ نفرت جھوٹ ہوس اور فریب بھرے ہوئے ہیں۔ ان عمارتوں کی اینٹوں میں گارا نہیں خون لگا ہوا ہے ۔۔۔ نیچے آجاؤ ۔۔۔ ورنہ تم اپنے آپ کو کھو دو گے۔

"نیچے آجاؤں ۔۔۔ لیکن کیسے"

لفظ "کیسے؟" سوال بن گیا تھا۔

تارکول والی سیاہ سڑک کو دیکھ کر میری رگ رگ میں دہشت کا اثر ہو گیا۔ دہشت اور وحشت دونوں نے ایک ساتھ یلغار کیا۔ میں لڑکے کے پاس جانا چاہتا تھا۔

"لیکن کیسے جاؤں؟"

میں ایک مجبور انسان ہوں۔ ایک ایسا انسان جو کبھی قدروں

میں اُلجھا ہوا پڑا ہے۔ تو کبھی حیدر باتوں کے ہاتھوں میں گرگٹ بنا ہوا ہے۔ کبھی روح کی آواز کے قبضہ میں ہے۔ کبھی ضمیر کا احساس ڈرتا ہے۔ بھلا ایک انسان کیسے امن سے رہ سکتا ہے۔ تخریبی عناصر ہر وقت اُس کے دماغ میں کام کرتے رہتے ہیں یا تو ایک بے حس جسم ہونا چاہیئے۔ جس میں نہ دماغ کی صدا ہو نہ ہی روح کے آتشیں جھونکے قرار دیتے تھا۔ ان سب سے بھلا کیسے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ایک ذہنی سرکش آدمی کو ــــ تب اچانک میرا ذہن پھسل کر اُس گھاس کے تنکے پر گیا۔ جو میرے ہاتھ میں تھا۔

"گھاس کا تنکا۔"

میں بڑبڑایا۔ کتنا ہی چھوٹا۔ کتنا ہی پیارا۔ اس کا ریشم جیسا بدن کسی دوشیزہ کے سڈول جسم کی یاد مجھے دلاتا تھا۔ لیکن اب تک بھلا یہ گھاس کا تنکا میری نظروں سے کیوں بچ رہا۔ مجھے افسوس ہوا گھاس کا تنکا مجھے کہہ رہا تھا۔

"گھاس کا تنکا جو ٹھہرا۔"

دھان کی بالیوں سے آیا ہوا گھاس کا تنکا نہ جانے کیوں میرے ہاتھ میں آگیا اور کب آگیا اور جہاں سے میرے ہاتھ میں آیا۔ وہاں تک کیسے چلا آیا۔ میں پھر بڑبڑایا۔

"تو گھاس کا تنکا ہے۔"

جس کے پاس نہ ماضی کا عکس نہ مستقبل کی فکر ہے۔ جو نہ قدردل

میں الجھا ہوا ہے نہ رسموں کا غلام ہے۔ جس کے پاس نہ ایمان کا خوف ہے نہ ضمیر کے تلخ تجربے ہیں۔ کیونکہ وہ ——

"گھاس کا تنکا ہے۔"

ایک میں انسان ہوں جو قدروں، رسموں کا غلام بن کے اپنے دماغ میں ہر لمحے بٹوارہ کرتا رہتا ہے۔ میں چیخ پڑا۔

"یہ دماغ کا بٹوارہ مجھے گوارہ نہیں ہے، نجات دلادے مجھے ایسے بٹوارے سے۔ اس کشمکش سے —— اس اضطراب سے۔"

تب پھر آواز آئی۔

"کہہ دو جاؤ۔"

میں پھر کشمکش و پنج میں پڑ گیا۔ میں پھر خیالوں کے طوفان کی گرفت میں آ گیا۔ کبھی ایک ہاتھ سے اپنے دماغ کو پکڑتا تھا کبھی دوسرے ہاتھ سے۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ کونسا "وہم" ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس پریشانی میں گھاس کا تنکا میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں چیخ پڑا۔

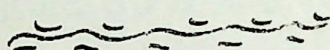
"گھاس کا تنکا۔"

وہ گر رہا تھا —— گر رہا —— میں سوچ رہا تھا۔

"نہ جانے اس گھاس کے تنکے کا کیا حشر ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

ایک سوال تھا۔ لیکن مجھے بہت جلد جواب ملا۔ گھاس کا تنکا صحیح و سالم تارکول کی سڑک پر لیٹ رہا تھا۔ اس کے جسم پر خراشیں نہیں پڑے۔ وہ مرا نہیں۔ اس کا وجود ختم نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ انسان نہیں تھا۔ گھاس کا تنکا ایک سفید فام انسان کے پاؤں کے نیچے آکر مر گیا۔ ہاں ایک انسان کے پاؤں نے گھاس کے تنکے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انسان کب ہی کسی کا وجود برداشت کرتا ہے۔



عورت اور مچھلی

وہ مچھلی جس کے جذباتوں میں گرمی ہو جس کے جسم میں جولانی ہے۔ وہ کب ہاتھ میں رہتی ہے۔ وہ تڑپتی ہے اور تڑپ کر پھسلتی ہے اور ہاتھ سے نکلنے کی کوشش میں محو ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مچھلی کے سڈول جسم کو دیکھ کر فوراً آدمی کے ذہن میں عورت کا سڈول جسم یاد آتا ہے یکھی مچھیرن جب سمندر کے ساحل پر مچھلیوں کو اپنے برتن میں ڈالتی ہے تو بڑی ہمدردی کے ساتھ ان مچھلیوں سے کہتی ہے۔

"بیچاریاں"۔

اکثر سکھی مچھیرن ان مچھلیوں کا دم توڑتے ہوئے اپنے ہاتھ میں دیکھنا چاہتی ہے۔ نہ جانے ایسا کرکے وہ کیوں خوش ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ عورت ہے اور عورت ہر کسی سڈول جسم کو اپنے ہاتھ میں کچلنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہی کامیابی اس کی غیر معمولی خوشی کا باعث بن جاتی ہے۔ سمندر میں کود کر ایک بہت بڑی مچھلی

بن کر چلی چھوٹی مچھلیوں کے گداز جسموں کو اپنے منہ کا لقمہ بنانا چاہتی ہے تاکہ ایک بار وہ کبھی کہہ سکے۔

"مجھ میں طاقت ہے کہ میں کبھی کسی کے سڈول جسم کو کچل سکتی ہوں"۔

یہ سب احساس کمتری کی بغاوت تھی۔ وہ ایک ہوش مند عورت تھی۔ کلو رام کی آواز اس کے کانوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی تھی۔ کلو رام کہتا۔

"ابھی تک بازار نہ گئی۔ کیا بھوکا مرنا ہے —— جاؤ —— بازار جاؤ۔ سب مچھلیوں کو فروخت کرنا۔ ورنہ تیری خیریت نہیں ہے"۔

کلو رام کے اس سلوک سے اس کو چڑ تھی۔ یہ ایک سلوک تھا۔ جو اس کے ذہن کو اس بات پر اکسا رہا تھا کہ وہ کلو رام ہے اور کلو رام سکھی مچھیرن۔

کلو رام اس کا خاوند تھا۔ دس سال ہوئے جب ان کی شادی ہوئی۔ تب سکھی صرف چودہ سال کی تھی۔ کلو رام بانکا نوجوان تھا۔ مچھیروں کی چھوٹی بستی میں ہر مچھیرن اس کو اپنانے کے خواب میں محو تھی۔ لیکن کلو رام کی نگاہوں میں چپکے سے سکھی آکر بس گئی۔

سکھی کا باپ بڑا غصہ آور آدمی تھا۔ بھنگ پی کر ہر رات اناپ شناپ بکتا تھا۔ سکھی اور اس کی ماں کو خوب پیٹ لیتا تھا۔ اپنے باپ کے اس انوکھے سلوک سے سکھی بہت تنگ

آگئی ۔ ماں کہتی تھی ۔ "مرد ذات ہوتی ہی ہے ایسی"۔

"مرد ..... مرد ..... مرد" سکھی کے ذہن میں ہر بار یہ لفظ گونجتا تھا ۔ اس کے لئے یہ سوال تھا ۔

"مرد کیوں ہوتے ہیں ایسے؟"

لیکن کون اس کو جواب دیتا، جواب کے لئے صرف اس کے پاس اپنا ذہن تھا ۔ وہ ذہن جو اس سے کہہ رہا تھا ۔

" اس لئے کہ عورت عورت ہے اور مرد مرد ہے" ۔

مرد اور عورت کے نازک رشتے اس کے ذہن میں الجھن بن جاتے ۔ اس کا ذہن مرد اور عورت کے دو سطحی لفظوں کو جانتا تھا ۔ ہاں ایک بات ضرور تھی ۔ نفسیاتی طور پر باپ کے غصّے نے اس کو احساس کمتری، عنایت کی پھیر نفت نے اس کو مرد اور عورت کا رشتہ سمجھا دیا ۔ جہاں ذہن کی گتھیاں سلجھ گئی ۔ وہاں مرد کے وجود سے وہ بھی نفرت کرنے لگی ۔ یہ نفرت بار بار اسے کہہ رہی تھی ۔

"میں اگر ایک بار مرد کے روپ میں جنم لیتی تو ....."

تو وہ غصّہ آور باپ کے چہرے پر ایک گھونسہ رسید کرتی وہ لہو لہان ہوتا ۔ لیکن کاو رام جب اس کو ملا تو وہ اپنے خیالات میں تبدیلی لانے کے لئے تیار ہوئی ۔ ان بدلے ہوئے خیالات کے پس منظر میں ایک چنگاری تھی، ایک ایسی چنگاری جو نفرت کے

ہر جال کو کاٹ پھینک دیتی ہے۔ وہ ہے محبت — ایک ایسی محبت سکھی کو دیکھ کے اُس کے غصہ آور باپ کا سرخ چہرہ سفید ہو گیا۔ اس سفید چہرے میں آتے ہوئے طوفان کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ یہ جھلک ایک آگ تھی۔ جس آگ نے سکھی کے باپ کو آگ بگولا بنا دیا — اور ایک بار سکھی پر اُس کے ظالم باپ کا قہر نازل ہوا۔ لیکن اس بار سکھی کو اس قہر سے کلورام نے بچا لیا۔ کلورام کو مرتے ہوئے باپ نے دو سو روپے کی پونجی سونپ دی تھی۔ کلورام بیوپاری قسم کی طبیعت رکھتا تھا — ایک ایسی طبیعت جو ہر بات کو نفع و نقصان کی ترازو میں تولتی ہے۔ سکھی پر دو سو روپے خرچ کرنا کوئی حماقت نہیں تھی۔ اسلئے کلورام نے سکھی کے باپ کے سامنے دو سو روپے رکھ کے کہا۔

"آپ میرے پتا کے برابر ہیں۔ مجھے اپنا بیٹا مان لیجئے۔"

ان رسمی باتوں میں نقد اور جنس کا سودا طے ہوا۔ سکھی نے سوچا اب وہ بے زبان گائے نہ رہی۔ اب اس انسان کو انسان بن کر اس کو پیار دینا تھا۔ لیکن اُس نے ایک جھوٹا خواب دیکھا تھا۔ ایک ایسا خواب جس میں حقیقت کا نشان تک نہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ پھر ایک بار کھو گئی۔ ایک انسان کے بیوپاری ذہن کی شکار ہو گئی تھی۔ وہ اکثر سوچتی تھی۔

"کیوں یہ آدمی ایک عورت کو غلام سمجھتا ہے۔ ایک مچھلی کی طرح بے بس اور بے کس ـــ جو مرد کے ہر جال میں ایک مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی ہے۔"

یہی سوچتے ہوئے وہ اکثر شہر کی گلیوں میں مچھلیاں فروخت کرتے ہوئے نظر آتی تھی۔ کلورام نے دو سو روپئے کے اس خریدے ہوئے غلام کی آمدنی میں آسانی سے زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن سکھی عورت تھی ـــ پیار کی متلاشی تھی ـــ زندگی کی خوشگوار جھونکوں سے ہمکنار ہونے کی امید رکھتی تھی، لیکن وہ سب اس کو نہ ملا۔ وہ ایسے سماج، ایسے رسموں اور ایسے مردوں کے چنگلوں سے آزاد ہو کر آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی تھی۔ اس میں بغاوت کا عنصر پل رہا تھا۔

ایک ایسا عنصر جس کو وقت یا تو سرد کر دیتا ـــ یا ـــ ایک جوالا مکھی میں تبدیل کر دے گا۔ شہر کی ہر گلی میں سکھی کی آواز جانی پہچانی تھی۔ مچھلی جیسی خوبصورت اور سڈول جسم والی سکھی اکثر نوجوانوں کے لئے ایک مئے کا پیالہ تھی۔ لیکن اب تک یہ صراحی دار گردن والی حسینہ کسی کے تشنگی کا شکار نہ ہو سکی۔ لیکن موہن ساہو تو اس تاک میں بیٹھا تھا کہ چوری چھپے ایک بار صرف ایک بار اس مئے سے اپنی تشنگی مٹا دے۔

اس لئے موہن نے آج سکھی سے کہا۔

"ہے سکھی تم سے کیا چھ سیر مچھلیاں مل سکتی ہیں"۔
"کیوں نا بابو"۔ سکھی نے جواب دیا "کب درکار ہے"؟
"کل شام چھ بجے لانا"۔
"ملے گا بابو"۔
صحیح بات بتانا۔ نہیں ــــ تو میں دوسرا انتظام کر دوں"۔
"نہیں بابو لاؤنگی"۔ سکھی نے اطمینان کے ساتھ کہا "اور ٹائم پر لا دوں گی"۔
"اچھا"۔
موہن ساہو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس میں شراب کا نشہ چھپایا جا رہا تھا۔ دوسرے دن سکھی نے مچھلیاں دن کے چار بجے برتن میں سنبھالتے ہوئے کلو رام سے کہا۔
"بہت دیر لگ جائے گی۔ ایک گاہک کو مچھلیاں دینی ہے"۔
"فکر مت کر۔ تو پیسہ لا"۔ کلو رام نے کہا۔ "میں آج مچھلیاں پکڑنے دور سمندر میں جا رہا ہوں"۔
"لیکن کلو جلدی واپس آنا"۔
"تم بھی سکھی جلدی آنا"۔
کلو رام نے اپنا سامان سنبھال کے سمندر کا راستہ لیا۔ وہاں پر اس کا چھوٹا بوٹ بھی تھا۔ چھ سال سے اس نے اس بوٹ کا استعمال

نہ کیا۔ مدھو نے کلورام سے کہا۔

"کلورام آج بہت مدت کے بعد پرانا راستہ کیوں یاد آیا۔ ایک ایسا راستہ جو تم کو بھول گیا اور تم جس کو بھول گیا"۔

"ہاں بھیا اب بہت بدلنا ہو گا"۔

بوٹ میں چپو مارتے ہوئے وہ بہت دور سمندر میں چلا گیا۔ آج تو وہ قسمت کا ایک نیا سلسلہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ لمبی رسی سمندر میں اتر گئی۔ وہ سوچنے لگا "کل سے اچھی خاصی آمدنی ہو گی۔ میں مچھلیاں پکڑوں گا۔ سکھی ان کو فروخت کرے گی"۔ لیکن سکھی اُس وقت موہن ساہو کے دروازے پر دستک دے رہی تھی "آؤ ۔۔۔ سکھی ۔۔۔ آؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔ میں تو کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ سکھی اندر آ گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ رات کے بارہ بجے تک ایک مچھلی کلورام نہ پکڑ سکا۔ مدھو نے اپنی چھوٹی کشتی سے آواز دی۔

"کیا ہوا ۔۔۔ کلو ۔۔۔ کچھ ملا"۔

"نہیں بھائی ۔۔۔ آج قسمت میں شاید کچھ بھی نہیں لکھا ہے"۔

"فکر کیوں کرتے ہو۔ ابھی بڑی مچھلی تمہاری رسی میں آ جائے گی"۔

"آ" کلورام بڑبڑایا۔

"کیا ہوا بھائی"۔ مدھو نے کہا۔

"مدھو ۔۔۔ شاید ۔۔۔ بہت بڑی مچھلی پھنس گئی ہے۔ تم ذرا

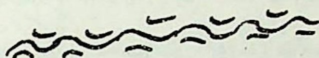
میری کشتی میں آجاؤ"۔

مدھو نے اپنی کشتی کو اُس کی کشتی کے ساتھ کیا۔ پھر وہ دونوں رسی کو کھینچنے لگے۔۔ وہ مچھلی ضرور تھی۔ لیکن ایک مردہ مچھلی تھی۔

کلو رام چیخ پڑا۔

"سکھی"!

سکھی کالے سمندر میں مچھلی بن گئی تھی ؛



مالک مکان کے نام

میں سیٹھ بدھو رام جی کے انوکھے IMPORT اور EXPORT دفتر میں دو سو روپے کا چپڑاسی ہوں۔ مجھے مہینے بھی تین قسطوں میں ملتا ہے۔ چپراسی سے لیکر منیجر تک سب ہی کچھ ہوں۔ بدھو رام کا نام صرف بدھو رام تھا۔ لیکن پیسے بنانے میں وہ ہرگز بدھو رام نہیں تھا۔ ایک دن بدھو رام کے انوکھے دفتر کے سامنے تین آدمی انتظار کر رہے تھے۔ میں ان تینوں کو اچھی طرح جانتا تھا اور پہچانتا تھا۔ ایک تو سیٹھ بدھو رام کے کالے پیسے کے بنائے مکان کا کرایہ دار تھا۔ دوسرا شہر کا نامی غنڈہ لٹھو رام تھا۔ تیسرا آدمی ۔۔۔ یہ کون ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ یاد آیا یہ سیٹھ صاحب کی اکلوتی لیکن پتلی بیٹی نرملا کے ساتھ مجھے کئی دفعہ ملے تھے۔ میں دفتر کا تالا کھولنے لگا تو مسٹر لٹھو رام نے نہایت انکساری سے مگر دھمکی کی مٹھاس لئے ہوئے کہا۔

"یہ خط لیجئے اور اپنے سیٹھ کو دیجئے۔"

وہ یہ کہتے ہی چلے گئے۔ پھر جناب کرایہ دار انوکھے وضع کے ساتھ کہنے لگے۔

"اے مسٹر یہ خط اپنے مالک کو دینا۔"

وہ بھی چلا گیا اور پھر میں قفل کھولنے لگا۔ لیکن نوجوان کے پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اس کی گڑگڑاہٹ نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کیا۔ "آپکو کیا تکلیف ہے۔"

"تکلیف" اس نے رعب جماتے ہوئے کہا۔ "تکلیف نہیں خط ہے۔"

خط دیکر جدید نوجوان ROCK-N-ROLL کرتے ہوئے چلا گیا۔ میں نے دفتر کا تالا کھولا۔ کرسی پر بیٹھا۔ میز پر تین خط تھے۔ نہ جانے میرا دل ان خطوط کو دیکھ کر کیوں مچل اٹھا۔ یوں تو کسی کا خط پڑھنا اخلاق کیخلاف ہے۔ لیکن اخلاق کے اصولوں پر آج کل عمل ہی کون کرتا ہے۔ پہلا خط جو میرے ہاتھ میں آگیا۔ وہ جناب کرایہ دار کا تھا مالک مکان کے نام۔

میں حضور مالک مکان آپ کو سلام نہیں کرونگا کیونکہ آپکے مکان اور اس مکان کے کرایہ سے اور پھر اس مکان کے آپ کے مالک ہونے سے . . . . .

. . . . آدھی روٹی کھانے پر مجبور کیا ہے۔ میری تنخواہ صرف تین سو روپے ہے اور اس میں آپ کے مکان کے تین کمروں کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ کا کرایہ میری جیب سے آپ کے پیٹ میں — نہیں — نہیں جیب سے تجوری میں چلا جاتا ہے۔ اسطرح آپ میری زندگی کی آدھی کمائی کو صرف مکان کے تین کمروں پر لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس سراسر ظلم کے خلاف ایک "دھرنا" کیا جائیگا یا آپ خود ہی کہئے کہ مجھے اس بے جا دولت سے اپنا گھر نہیں بھرنا ہے۔

آپکی بیٹی نرملا کا دل آپ کی طرح ڈائمنڈ کا نہیں گوشت کا بنا ہوا ہے ہماری حالت دیکھ کر کہتی ہے — "چاچا جی میرے بس میں ہوتا تو میں آپ سے کوئی کرایہ نہ لیتی۔"

حضور سیٹھ صاحب اگر آپ نے اپنے فیصلہ جات پر نظر ثانی نہ کی۔ مہنگائی کے اس زمانے میں کرایہ کم نہ کیا تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاؤنگا کہ کسطرح آپ کے نرم دل بیٹی نرملا اس کے مکان کی مالکن بن جاتی ہے۔

بدھو کیلئے اشارہ کافی ہے۔

بے ایمان مالک کا ایمان دار کرایہ دار ـــــ ٹھگ لال

اب دوسرا خط جو میرے ہاتھ میں آگیا وہ مٹھو رام غنڈے کا مالک مکان کے نام تھا۔" ہم غنڈوں کی دنیا میں سلام کے بدلے چھری دکھائی جاتی ہے لیکن اس سلام سے پہلے میں آپ سے اس بات کا مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے ٹھگ لعل کرایہ دار کو اپنے اس مکان سے نو دو گیارہ کیجئے۔ اس ازلی کمبخت کے پاس سونے کا ایک زیور بھی نہیں۔ پھٹی ہوئی ساڑھیوں کے علاوہ اس کے پاس پھٹی ہوئی غربت ہے، ایسے آدمی کے مکان پر میں ڈاکہ ڈالنا نہیں سمجھتا ہوں۔ مجھے تو چاہیئے کالے اور سفید نوٹوں سے بنا ہوا بدھو رام ــــ اور پھر تمہارے اس کرایہ کے مکان پر ڈاکہ ڈالنا اتنا آسان ہے جتنا جیب میں ہاتھ ڈالنا ہے۔ تمہاری وہ بیٹی ہے نا۔ مجھے چاچا کہتی ہے۔ ایک دن کہنے لگی "چاچا جی نہ جانے میرا باپ کیوں دن بہ دن کنجوس ہوتا جا رہا ہے اچھا خاصا مکان کرائے پر اٹھا رکھا ہے اور ہم اس گندے مکان میں رہتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو ابھی اس مکان میں جاتی۔"

بدھو رام جی اپنا ارادہ تبدیل کیجئے اور اس مکان میں آجائیے۔ ورنہ مجھے نرملا دیوی کو اس مکان میں لانا پڑے گا۔ پھر مجھے افسوس ہوگا کہ ہماری "سلام" تمہارے مکان کے بدلے کسی گلی کوچے میں ہو گی۔

تمہارے مکان کا دوست لیکن تمہارا دشمن ـــــ مٹھو رام

مالک مکان کے نام

عاشقوں کی دنیا میں سلام نہیں کی جاتی ہے۔ آنکھیں بچھائی جاتی ہیں اور اشا

آنکھوں سے اپنا دردِ دل سنایا جاتا ہے۔ لیکن میں تمہیں اپنا دردِ دل آنکھوں سے نہیں اپنے قلم سے سناؤنگا۔ میں عاشق ہوں تمہاری بیٹی کا۔ واری ہوں اُس کی ہر ادا پر۔ لیکن اس عشق کی دنیا میں جب تذکرہ آتا ہے مکان کا وہ عشق بے مزہ ہوتا ہے۔ تمہاری بیٹی اکثر تمہارے کرائے کے مکان کا تذکرہ کرتی ہے تب اس عاشق کے سینے میں تیر آجاتا ہے۔ میں غریب ہوں۔ لیکن پھر بھی میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔

"کاش میں امیر ہوتا پھر میں بھی تیرے گھر کے سامنے گھر بناتا ہوں"۔ لیکن مجھ جیسے غریب عاشق کے لئے آجکل مکان بنانا جوئے شیر لانے کے برابر ہے اس لئے آپ سے التجا ہے۔ . . . . . . کہ آپ کرائے کے مکان میں خود چلے جائیے تاکہ عشق کی دنیا میں پھر بھی اس کرائے کے مکان کی ذکر نہ آئے اور پھر جو آپ کی بیٹی کا اور میرا چند دنوں کا ساتھ ہے وہ بغیر کسی کھٹکے سے گذرے کیونکہ میں جانتا ہوں۔ مجھ جیسا غریب عاشق آپ کا داماد نہیں بن سکتا ہے اگر آپ نے میرے مشورے پر عمل نہ کی تو مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ میں کس طرح نرملا اور نرملا کے کرائے کے مکان کو حاصل کروں۔

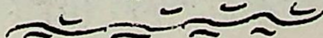
عاشق ——— چونی لال موتی

تین خط ختم نہ ہوئے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے شور مچایا۔

میں نے کہا ——— "ہیلو"

"آپ کو یہ خبر دی جاتی ہے کہ آپ کا مالک ابھی ابھی کار کے حادثے میں مر گیا"۔ ——— "ایں" میں چونک پڑا۔

سامنے تین خط تھے ——— نرملا دیوی ——— اور تین خط ———



گھر سے کالج تک

گھر سے کالج تک کا راستہ کتنا چھوٹا ہے؟ کتنا لمبا ہے؟ کتنا اچھا ہے؟ کتنا بُرا ہے۔ نہ جانے گھر سے کالج تک راستے پہ چلتے ہوئے چہرے دماغ میں کیا کیا خیالات آتے ہیں۔ دماغ ہے ہی خیالاتوں کا گہوارہ، خیالاتوں کو دماغ میں آنے سے کون روک سکتا ہے۔ ہر دن صبح کو منہ ہاتھ دھو کر بالوں پر تیزی سے کنگی کو چلا کے صاف و شفاف قمیض پہن کے، جوتوں کو پالش سے چمکا کر کالج جانے کے لیئے تیار ہوتا ہوں۔ ماں سے پچاس پیسے یہ کہکر وصول کرتا ہوں۔

"اے ماں آج گرمی شدت سے پڑ رہی ہے۔ ایسی گرمی میں دو تین بار دن میں لیمن (LEMON) کا پانی ہی پڑتا ہے۔ اے [illegible] تو نہیں جانتی ہے کہ دن میں مجھے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ [illegible] ماں تو نے پڑھا ہوتا تو پھر ہی تو یہ سمجھتی کہ علم کیا بلا ہے۔"

ماں سے تقریباً جھگڑ کے اور گھر [illegible] باہر آ کے آزاد فضا میں

گہری سانس لی۔ اُس کے بعد اپنی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ یہ ساڑھے بارہ روپے کی گھڑی میرے باپ کو اُس کے باپ نے میٹرک پاس کرنے کی خوشی میں دی تھی۔ میں نے جب میٹرک پاس کیا تھا تو میں نے ابا جان سے ایک جدید قسم کی موٹر سائیکل لانے کا مطالبہ کیا تھا۔ خیر غربت کے حال سے ہم کب آزاد تھے۔ جو وہ ایک موٹر سائیکل لاتا۔ لیکن اُس نے یہ کہہ کر پرانی گھڑی لینے کے لئے آمادہ کیا کہ ایک تو یہ بزرگوں کی نشانی ہے۔ دوسرا یہ وقت یاد دلاتی رہے گی جو ایک طالب علم کے لئے ضروری چیز ہے۔ اس پرانی گھڑی کو پرانے انداز سے دیکھ کر مجھے یہ پتہ چلا کہ ابھی کلاس شروع ہونے میں پورے دو گھنٹے باقی ہیں۔ اس لئے دل ہی دل میں گھر سے کالج تک پیدل جانے کا ارادہ کیا۔ راستے میں نکو اور اُس کے دوستوں سے ملے۔ اس کے باپ نے نکو کا نام ناصر رکھا تھا لیکن جوا [illegible] یہ نام ایسا ہوا کہ اس کا نام بگڑتے بگڑتے نکو رہ گیا۔ اب [illegible] پیشہ بن گیا تھا۔

[illegible] اس لئے ڈرتا تھا کہ میں اُس کے تاش کے پتوں [illegible] سے واقف ہو گیا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اگر یہ کالج کا [illegible] چلتے دیکھ لے گا تو میرا کام چوپٹ کر دے گا۔ میں اُس کے قریب آ گیا۔ سلام اور کہا۔

"کیوں استاد کیا ہو رہا ہے؟"

"جو ہو رہا ہے ہونے دو۔"

میں نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اُستاد۔"

"جی بیٹا۔" میں نے پوچھا۔ "ابھی لی شروع نہیں ہوئی ہے"۔

اور اس کے ساتھ ہی اچانک استاد کی زبان تیزی سے چلنے لگی۔

"قسمت آزماؤ —— دس کے بیس —— بیس کے تیس۔"

میں سوچنے لگا کہ استاد کو اتنا جلدی جنوں کیوں آ گیا۔ سامنے دیکھا تو دو کسان آ رہے تھے۔ بیچارے تاش کے تین پتے "غلام، بیگم، بادشاہ" کو قسمت کا کھیل سمجھ کر اپنی پونجی لٹا بیٹھے۔ میں نے نکو کہا۔

"اُستاد ہاتھ بھاری مارا۔"

"ہاں مارا"

میرے ہاتھ میں پچاس پیسے رکھ دیئے۔ اور اُستاد اپنا راگ الاپنے لگا۔ "قسمت کا کھیل۔"

اُستاد کے ساتھ بہت بہت بک بک کی ۔ اس لئے دماغ کو ترو تازگی کی ضرورت تھی۔ میں سامنے کے چائے خانے میں گھس گیا۔ یہ چائے خانہ دقیانوسی قسم کا چائے خانہ تھا۔ جہاں بیٹھ، پیسے کو

ایک چائے کا کپ ملتا تھا۔ بیرا آیا۔ یہ اس ہوٹل کا مالک، منیجر اور بیرا سب کچھ تھا۔ اُس نے کہا۔

"جناب"۔

"ایک چائے کا کپ"۔

"بیس پیسے"۔

بیس پیسے"۔

"اُدھار نہیں ملتا ہے"۔

"میں بھی اُدھار نہیں لیتا ہوں"۔

وہ بڑبڑانے لگا۔

"تم کالج کے لڑکوں کو خدا ہی سمجھے"۔

میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "ہم نے کیا لے لیا تیرا"۔

"کچھ نہیں"۔ اُس نے نرم لہجہ میں کہا۔ "معاف کرو"۔

شاید وہ سوچتا تھا۔

"اب تم سے کون جھگڑا مول لے۔ جھگڑا مول لیا تو تم بھوک ہڑتال کرو گے۔ پھر جلد ہی کالج کے لڑکے نعرہ دیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ میرا جینا دوبھر ہو جائے گا"۔

میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

چائے کی پیالی ابھی معدے میں نہ اترنے پائی تھی کہ گاڑی کا

ایک آدمی آیا۔ اُس نے کہا۔

"بھائی صاحب آپ کالج جاتے ہیں؟"

"ہاں"

"تو میرا ایک کام کیجئے۔ مہربانی ہوگی۔"

"کہو، کہو۔"

"یہ خط پڑھ لیجئے۔"

میں نے چائے کی پیالی نیچے رکھی اور خط پڑھنا شروع کیا۔

"اباجی۔"

مدت ہوئی آپ کو شہر گئے ہوئے۔ اب تک خط لا نہ کوئی کارڈ ملا۔ یہاں پر سب لوگ خیریت سے ہیں اور ... آپ کے لئے دعا گو ہیں۔ آج کل ساہوکار ہر صبح گھر آتا ... بیس دن میں دو سو روپے نہ ملے تو عدالت سے اجازت لا کے زمین پر قبضہ کروں گا۔ اباجی کچھ کیجئے اور زمین کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔

تمہارا بیٹا

قیوم

میں نے دیکھا کہ کسان کے آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ لیکن اُس نے آنسوؤں کو پی لیا صرف یہ کہنے لگا۔

"بالو میں اب تک صرف پچاس روپے جمع کر سکا۔ دس دن میں ڈیڑھ سو روپے کہاں سے جمع ہوں گے۔ کیا ہو سکتا ہے ــــ لیجیے ــــ"
یہ کہتے ہوئے وہ چلا گیا۔ میرے لبوں پر نہ جانے کیوں یہ لفظ آ گیا۔
"بیچارا۔"
لیکن چائے مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ بیس پیسے دے کے چائے خانے سے باہر آیا۔ اسلم اور اکبر دور سے چیختے ہوئے آئے۔
"شوکت بھائی ذرا ٹھہرو۔"
میں ٹھہرا اور وہ دونوں میرے قریب پہنچ گئے۔ اسلم نے کہا۔
"تم نے سنا؟"
میں نے حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"کیا؟"
اسلم نے کہا۔ "جناب یہ بتایئے تین مہینے کے بعد ہی امتحان لینا سراسر زیادتی ہے نا۔ اس ظلم کے خلاف ہڑتال ہونی چاہیئے۔"
میں نے ان دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
"اس میں برائی ہی کیا ہے ــــ کالج کے بجٹ میں خرچ دکھا لیں گے۔"
اسلم بول پڑا۔
"اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانی ہوگی۔"

میں نے بھی اُس کی تائید میں اپنی گردن لمبی کی۔ مگر لنچ کا لنچ آ گیا۔ اسلم اپنی ہڑتال بھول گیا۔ یہاں تک ہم تینوں سب کچھ بھول گئے اور ہمارے ذہن میں صرف بھرپا کھیلے، چمکیلے فراک، ڈوپٹے گھومنے لگیں۔ اسلم میرا ہاتھ پکڑ کے کہنے لگا۔

"اس لڑکی کو جانتے ہو۔ وہ سرخ والی ہے نا"۔

میں نے اُس کے حُسن کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"جس کی بڑی بڑی آنکھیں ہیں"۔

اسلم نے سر اقرار میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ـــ ہاں ـــ اس کا نام سریتا ہے۔ یہ ایک ایسے لڑکے پر مرتی ہے ـــ کیا کہوں یار ـــ وہ لنگور ہے اور یہ حور ہے بس مجھے اس کی قسمت پر رشک آتا ہے"۔

اب اکبر نے دوسری طرف ایک سبز ڈوپٹے والی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ لڑکی ہے نا۔ اس کا نام زبیدہ ہے۔ اس کا AFFAIR اپنے رشتے کے لڑکے کے ساتھ ہے"۔

ایک کرسچین لڑکی ننگی باہیں ہلاتے ہوئے آ گئی۔ اکبر نے اپنے منہ پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"اس کی باہیں"۔

"بیوقوف مت بنو"
اکبر ۔۔۔ یہ کہتے ہوئے میں نے لڑکی کی طرف آنکھ ماری۔ اس
کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔ میں نے کہا۔
"آزاد خیال لڑکی"
اس لمحے ایک لڑکا سائیکل پر دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا۔
"ارے تم لوگ یہاں ہو۔ ہسٹری کا گھنٹہ شروع ہوا"
پھر ہم سب کچھ بھول گئے۔ دوڑتے ہوئے کلاس میں پہنچ
گئے۔ پروفیسر بورڈ پر لکھ رہا تھا۔
"ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۔۔۔ لارڈ رسن ۔۔۔
کرزن ۔۔۔ وہاں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ سرینا کی بڑی بڑی آنکھیں
تھیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ نکّو کے تاش کے پتے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔
وہاں پر زبیدہ کا سبز ڈوپٹہ لہرا رہا تھا ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ وہاں
پر کسان دو سو تھے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ وہاں پر کرسچین لڑکی کی
سفید باہیں تھیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ وہاں کچھ تھا ۔۔۔ کچھ بھی
نہیں تھا:

جب لوگ لوٹتے ہیں

جج صاحب اندر نہ اُس کا امکان وہ دن کھول سکتا تھا۔ جب جج کی بیوی اچلا کو اُس کے نوکر نے یہ اطلاع دی کہ سرنیتا اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ اچلا پریشان ہو اُٹھی۔ وہ سرنیتا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ اچانک اُس کی نظر میز پر رکھی ہوئی پرچی پر پڑ گئی۔ اُس پر لکھا تھا۔

"میں نے خودکشی کی۔ مجھے جینے کا کوئی حق نہیں رہا۔ اس لئے مرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اس خودکشی کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہوتی"۔

اچلا کے اعصاب پر یہ پرچی پڑھ کے رعشہ طاری ہوا۔ وہ چلانا چاہتی تھی۔ مگر چلا نہ سکی۔ اُس کے تمام اعصاب بے حس و حرکت ہو گئے۔ اُس کی زبان پر صرف ایک ہی لفظ رہ گیا۔

"میری بیٹی"۔

جج صاحب نے جب بیوی کا یہ حال دیکھا تو وہ گھبرا اٹھا۔ اُس کے ہاتھ میں سرنیتا کی لکھی ہوئی پرچی آ گئی۔ وہ پڑھنے لگا۔ یوں تو جج صاحب

مضبوط دل کے آدمی تھے اگر ——— وہ کسی کو پھانسی کی سزا دیتے تھے تو اس کا دل ہل نہ جاتا تھا۔ لیکن اپنی بیٹی کی خودکشی کی خبر سن کر اُس کا سر چکرانے لگا۔ سرجو نے جب سارے گھر میں ماتمی فضا پائی تو وہ دوڑتے ہوئے جج صاحب کے بھائی رمیش کے پاس گیا۔ سرجو نے جب اُن کو یہ خبر سنائی تو وہ دوڑتے ہوئے جج صاحب کے پاس آ گئے۔ رمیش جج صاحب کو تسلی دلاسا دینے لگے اور کہنے لگے۔

"جو ہوا اُس میں بھگوان کی مرضی تھی۔"

رمیش کے آنے کے بعد ہی جج صاحب کو گھر کے سامنے لوگوں کا تانتا بندھا دکھائی دیا۔ اب دیکھئے جو لوگ بے کار رہتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جج صاحب کے مکان پر ڈیرہ جما بیٹھے۔ لوگوں کے جھرمٹ میں ایک نوجوان کہہ رہا تھا۔

"میرے خیال میں پولیس کو اس بات کی اطلاع دینی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے سرتیا نے دریا میں چھلانگ لگائی ہو۔ شاید اس کی لاش دریا میں ملے گی۔"

ایک بوڑھے منشی اوم کار ناتھ نے کہا۔

"بیٹے میں نے یہ بال یونہی دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ اس بات کی اطلاع پولیس کو نہ دی جائے۔"

نوجوان نے کہا۔ "شریمان میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"بیٹے جوانی کی بھول جب رنگ لاتی ہے تو اس کو چھپانے کے لئے موت کے منہ میں جانا ہی پڑتا ہے۔"

نوجوان بوڑھے کی اس بات سے مرعوب ہوا۔ اور اس نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اُن کے سامنے ایک اور جھرمٹ تھا۔ اس جھرمٹ میں کالج کے نیشنیل لڑکے حالات پر گفتگو کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک لڑکے انوپ کمار نے کہا۔

"میرا خیال جہاں تک ہے یہ وہی لیلیٰ مجنوں والا پرانا قصہ ہے۔ سہہ نہ پائی محبوب کی جدائی اور موت کو گلے لگا لیا"۔

انوپ کمار کی اس بات پر دوسرے لڑکے غور سے سوچنے لگے اور یہ تسلیم کیا ... اب ایک اور جھرمٹ اس فکر میں مبتلا ہوا کہ اگر سرتیا نے خودکشی کی تو کس قسم کی خودکشی کی ہوگی۔ سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر نے کہا۔

"جہاں تک کشمیر میں خودکشی کی واردات کا پتہ چلتا ہے وہ سب دریا میں کود جانا بہتر سمجھتے ہیں اور اسی لئے جہاں تک میرا خیال ہے سرتیا کی لاش کو دریا میں ہی تلاش کیا جائے"۔

جج صاحب کے قریبی دوست گہرے سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے اُن کا دوست وکیل امرناتھ کہہ رہا تھا۔

"اب جناب یہ بات قطعی طے پائی کہ شاید کسی ناکامی کی وجہ سے

آپ کی بیٹی نے ایسا خطرناک قدم اٹھایا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اس طرح ختم کرنے کے لئے ابھی بھی تیار نہ ہوگی۔ بہتر یہی ہوگا کہ اب پولیس میں رپورٹ درج کی جائے اور وہ لوگ تلاش پارٹیاں روانہ کریں گے۔"

جج صاحب کو یقین نہ آیا کہ اس کا گہرا دوست اس کو یہ مشورہ دے رہا تھا۔ کیونکہ جج صاحب اچھی طرح جانتا تھا کہ بات پولیس کے ہاتھوں میں جانے کے بعد اور بھی الجھ جائے گی۔ جج صاحب نے اپنے دوست سے کہا۔

"آپ یہ مشورہ دیتے ہیں"۔ اس کے دوست نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "میں جانتا ہوں آپ کو میرا یہ مشورہ پسند نہیں ہے۔ لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے"۔ جج صاحب نے اپنے گہرے دوست سے کچھ نہ کہا اور وہ اپنی بیوی سے اکیلے میں مشورہ کرنے لگے۔ اس کی بیوی کی آنکھیں روتے روتے سوجھ گئیں۔ اس کے خاوند نے کہا۔

"اب لوگ کہتے ہیں کہ پولیس میں رپورٹ درج کرنی چاہیئے"۔

"کیا؟"

تھوڑی دیر کے لئے سرینا کی ماں سرینا کا غم بھول گئی۔ اس پر دنیاوی خیالات غالب آئے۔ اس لئے اس نے کہا۔

"نہیں ـــ نہیں ـــ ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ آج کل کی

لڑکیوں کی انوکھی حرکتوں سے واقف نہیں ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ یہ سب راز ہی رہے۔" لیکن جج صاحب اس بات سے متفق نہیں تھے جج صاحب کے مکان کے باہر چند آدمی جمع تھے۔ اُن میں سے ایک نوجوان کشور تھا۔ کشور نے کہا۔

"ارے تم یقین نہ کرو گے کہ یہ لڑکی جب چند دن پہلے میری بہن سے ملنے آئی تھی۔ کیا کہوں کتنی شوخ لڑکی تھی۔ میں یقین نہیں کر سکتا ہوں کہ اس لڑکی نے خودکشی کی ہوگی۔" پھر اُس نے اپنے دوست سے کہا۔

"یقین کرو میں اُس کے ساتھ محبت کرنے کا پلان بنا رہا تھا۔ لیکن اب میں بھگوان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُس نے میرے اس پلان پر عمل کرنے میں چند دنوں کی دیر کی۔ ورنہ ایک عدد محبوبہ کے غم میں آج میں سینہ پیٹتا ہوا نظر آتا۔"

وہ بوڑھی عورتیں جو جج صاحب کے مکان میں داخل ہو رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک عورت نے دوسری عورت سے کہا۔

"میں کہتی ہوں یہ سب نئی تعلیم کا قصور ہے۔ مالتی یہ نئی تعلیم بُری ہے۔ اس نے لڑکیوں کو خودسر اور باغی بنایا۔ دوسری عورت نے کہا۔

"ہاں سیتا مجھے اس لڑکی کے بارے میں دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔"

منشی اوم کار ناتھ، نیشن ایبل لڑکا، انوپ کمار، سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر، نوجوان آدمی کشور، مالتی اور سیتا کے چہروں پر ایک ہی سوال تھا کہ کب جج موتی لال پولیس میں رپورٹ درج کراتا ہے اور پولیس کی تحقیقات سے یہ راز فاش ہوگا۔ لیکن جج موتی لال شش وپنج میں پھنس گیا۔ ایک طرف خاندان کی عزت کا سوال تھا اور دوسری طرف بیٹی کا سوال تھا۔ وہ اب تک فیصلہ نہ کر سکا کہ کس کا ساتھ دے۔ لیکن اس کے رشتے دار اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ پولیس میں رپورٹ کرنی چاہیئے۔ رمیش بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ "اب یہ معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا۔ جج صاحب کو ضرور پولیس میں رپورٹ دینی چاہیئے۔" اور وکیل امر ناتھ بھی اس بات پر زور دے رہا تھا کہ پولیس میں رپورٹ کے بغیر معاملہ سمجھ میں نہیں آسکتا۔

ان چند لوگوں نے اپنی اپنی رائے زنی سے پورے مکان کو سر پر اٹھایا تھا۔ یہاں آدمی وہی باتیں سنتا تھا۔

"پولیس ...... رپورٹ"

اگر اس شور میں کوئی پریشان صورت نظر آتی تھی۔ وہ نوجوان سریندر تھا۔ نوجوان سریندر کو یقین نہیں آتا تھا کہ سرنیا نے خودکشی کی ہوگی۔ کل ہی سرنیا سے اس نے کہا تھا۔

"دیکھو سرنیا یہ بالکل سچ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے والہانہ پیار کرتے ہیں اور اسی طرح کرتے رہیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہم کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات کبھی ہم کو نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ تم ایک امیر باپ کی بیٹی ہو اور میں ایک غریب باپ کا بیٹا ہوں۔ یہ امیری اور غریبی کا فرق ہمارے لئے دیوار بن سکتی ہے ——" اس سے آگے وہ اپنے الفاظ کو ادا نہ کر سکا۔ سرنیا نے ایک ادا سے پل کھا کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"سریندر میرا باپ پرانے اور بوسیدہ خیالات سے بالاتر ہے۔ میرے پاکیزہ خیالات کا وہ احترام کرے گا۔ مجھے ایک گائے کی طرح فروخت نہیں کرے گا۔ میرے فیصلے کو وہ کبھی رد نہیں کرے گا۔ تم کل ہی اپنے باپ کو میرے گھر بھیجنا وہ ضرور ہمارا رشتہ پکا کر کے آئیگا۔"

سریندر گہری سوچ میں غرق ہوا۔ "شاید سرنیا نے اس کا ذکر اپنے باپ سے کیا ہوگا اور اس کے باپ نے امیری کی چٹان کھڑی کی ہوگی۔ کیونکہ وہ ایک دولت مند جج ہے۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی پھول جیسی بچی ایک مفلس کے گھر میں جائے۔ لیکن سرنیا نے اپنی بے پناہ محبت سے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا ہوگا۔

اب مجھے بھی اپنی محبت کا ثبوت سرنیتا کی روح کو دینا چاہیئے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے بیقرار رہتی تھی۔ اب بھی شاید تڑپ رہی ہو گی۔ اب مجھے بھی اپنی پیاری سرنیتا سے جلدی ملنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ سرنیتا کی روح مجھے بے وفا سمجھ بیٹھے۔

سریندر شور و غل کے ماحول سے تیز قدم بڑھاتا ہوا جج کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ تاکہ وہ بھی اس ویران دنیا کو چھوڑ کر وہاں جائے۔ جہاں اس کی سرنیتا اسی کو پکار رہی ہے۔ لیکن اس سے پہلے وہ اپنے اضطرابی خیالات کو عملی جامہ پہنائے اچانک ایک سریلی آواز ان گنے چنے لوگوں کے شور میں ابھری۔

"ڈیڈی — یہ کیا ہنگامہ بپا ہے" یہ سرنیتا کی آواز تھی۔

سب سرنیتا کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ جج صاحب آگے بڑھے اور سرنیتا سے پوچھا "تو کیا تم نے خودکشی نہیں کی" — "کیوں ڈیڈی میں کیوں خودکشی کرتی"۔ سرنیتا نے فوراً جواب دیا — جج کی بیوی اچلا نے کہا۔

"ارے بیٹی تم نے اپنے کمرے میں پرچی رکھی تھی۔ جس پر تم نے لکھا تھا کہ تم نے خودکشی کی ہے" — سرنیتا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ — ارے ماں وہ ہمارے کالج میں ڈرامہ ہے۔ اور میں بھی اس ڈرامے میں کام کرتی ہوں۔ چونکہ وہ مجھے زبانی یاد کرنا تھا۔ اسلئے میں نے وہ پرچی پر لکھا تھا"۔

سب یہ سن کر حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ●●

یہ دوڑ

وہ اپنے مکان — جو پرانے طرز کا ایک قدیم مکان تھا، میں داخل ہوا۔ یہ مکان آج کے جدید سماج میں مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اسی مکان کی ایک پرانی کھڑکی پر جو سڑک پر کھلتی تھی وہ ہر دن ملک کے حالات پر نظر ڈالتا تھا۔ آج جب وہ کالج سے واپس آیا اور اپنے مکان کی اسی کھڑکی پر بیٹھا تو اس کو ہسٹری پریڈ کا وہ واقعہ یاد آیا۔ جو اب تک اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ ہسٹری پروفیسر نے کہا تھا "اکبر مجھے پورا اعتماد ہے کہ تم یہ دوڑ جیت لوگے ...." نہ جانے پروفیسر کیا کہتا رہا۔ لیکن اکبر سب سے پہلے اپنے اس پروفیسر سے ایک بات کہنا چاہتا تھا۔

"کس دوڑ کے بارے میں آپ کہہ رہے ہیں"

ہاں یہ ایک سوال تھا۔ جس کا وہ جواب چاہتا تھا۔ دنیا ایک دوڑ میں شامل ہوئی تھی۔ جہاں تباہی کے آثار سر اٹھنے کے بعد قریب سے قریب تر نظر آ رہے تھے۔ کیا اس کا پروفیسر چاہتا تھا کہ وہ ایک ایسی دوڑ میں شامل ہو جائے — ہاں ایک ایسی دوڑ جو سماج انسانیت کی تباہی

کے سمندر میں ڈوب لے جائے۔ نہیں وہ اس کو ایک ایسی دوڑ میں شریک ہونے کو نہیں کہتا تھا۔ وہ کالج کی ایک ایسی دوڑ تھی جس میں مقرر کردہ فاصلہ طے کرنا تھا۔ تب ہی وہ دوڑ جیت سکتا تھا۔

"فاصلہ .... دوڑ"

"کونسا فاصلہ .... کونسی دوڑ"

سڑک پر چلتی ہوئی ان چھوکریوں کو دیکھ کر اُس کے دل نے پھر یہ سوال کیا۔ وہ چھوکریوں کو جو ہائی ہیل اور چہرے بنی ہوئی دیوانہ میں رہتی تھی۔ جس کو کبھی بھول کر بھی سورج کی کرن کو نہیں چھو لیا تھا۔ جس کا چہرہ سات پردوں میں چھپا رہتا تھا۔ ایک ایسی دوڑ میں شریک ہوئی۔ جو جذبات میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے .... ایک ایسی دوڑ میں شریک ہوئی۔ جس کو فیشن کی دوڑ کہتے ہیں۔ یہ فیشن کا دوڑ اس کو کہاں لے جائے گی۔ پتھر کے زمانے تک .... یا وہ ہار کر بیٹھ جائے گی۔ اُس کی ننگی باہیں اور ٹانگیں دعوت گناہ کے لئے انسان کو اُکسا رہی تھیں۔ لیکن کیا اس کی ننگی باہیں اور ٹانگیں آج کے اس جدید سماج کا ایک حصہ نہیں ہے یا بقول جدید سماج کے معماروں کے ــــ

ایک دقیانوسی خیال ہے۔ تب اس کو یاد آتا ہے کہ اس کو ایک ایسی دوڑ میں شریک نہیں ہونا ہے۔

پھر اس دوڑ کے بارے میں وہ کیوں سوچ رہا ہے۔ وہ تو کالج

کی دوڑ میں شریک ہو رہا ہے۔ وہ پھر کیوں ایک ایسی دوڑ کے بارے میں سوچ لے۔

وہ ادھیڑ عمر کی عورت جو سڑک پر کسی کنواری کی طرح چل رہی تھی۔ کس دوڑ میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ بڑھاپا پوری قوت کے ساتھ اس پر یلغار کر رہا تھا۔ وہ اس بڑھاپے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ وہ قانون خدا کے راستے میں ایک دیوار بننا چاہتی ہے۔ وہ بڑھاپے کی جھریوں کو غازے میں چھپانا چاہتی ہے۔ وہ سفید بالوں کو خضاب دے کر ان کی سفیدی کو سیاہ رنگ میں چھپانا چاہتی ہے۔ لیکن کب تک وہ قدرت کی قاتل ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ اس کی میک اپ کی دوڑ اس کو کہاں تک لے جائے گی۔ اس کے اشارے کب تک نوجوان چھوکروں کو اپنی طرف کھینچتے رہیں گے۔ کب تک نوجوان چھوکرے ایسی عورتوں کو دیکھ کر فحش گالیاں بکتے رہیں گے۔ کب ان کو یہ احساس ہوگا کہ یہ ایک ادھیڑ عمر والی عورت ہے۔

ایک جانور نہیں ... یہ ایک عورت ہے۔ جو ماں ہے۔ جو بہن ہے، جو بیٹی ہے۔ فحش گالیوں کی یہ دوڑ ان نوجوانوں کو کہاں تک لے جائے گی..... کہاں لے جائے گی۔ لیکن وہ اس دوڑ کے بارے میں کیوں سوچتا ہے۔ اس کو ایک ایسی دوڑ میں شریک ہو کر سمجھنا

ہے۔ اس کو ایک سیدھی سادھی دوڑ میں شریک ہونا ہے۔ جس
میں فاصلہ طے کرنا ہے۔ لیکن اب وہ کیسے اس فاصلے کو طے کرے
گا۔ اس کو یاد ہے کہ پچھلے سال بھی اس نے تین میل کی دوڑ میں پہلے
نمبر پر آ کر ایک چاندی کا کپ حاصل کیا تھا۔ لیکن تب وہ اس
جدید سماج کی دوڑوں کے بارے میں نہیں سوچتا تھا۔ تب اس
کو یاد آیا کہ روس اور امریکہ کے درمیان اٹم بم، ہیڈروجن بم
اور آکسیجن بم کی دوڑ ہے۔ انسان کو یہ دوڑ کہاں لے جائے
گی۔ دنیا نے ایک تباہ کن راستہ اختیار کیا جہاں ہر دم موت
کا سایہ انسانی زندگیوں پر لٹکتا ہے۔ جہاں ویٹ نام کے میدان کا دھواں
ہزاروں انسانوں کو ہر لمحے کے لئے موت اور زیست کی کشمکش میں
مبتلا کرتا ہے۔ یہ بھی تو ایک [illegible] دوڑ ہے۔ ایک ایسی دوڑ میں
CAPTILISM اور COMMUNISM ایک دوسرے سے
سبقت لینا چاہتے ہیں۔ جس نے دنیا کے امن و امان درہم برہم
کر کے رکھا۔ جس نے سچائی کو جھوٹ کے لبادے میں ڈھانپ لیا۔
یہ دوڑ انسانوں کو کہاں لے جائے گی۔

لیکن جانے دو اس دوڑ کو ...... اس دوڑ کے تذکرے ....
کل اس کو ایک بار پھر تین میل کی دوڑ میں شامل ہونا ہے۔ اسکو ایک
مقرر کردہ فاصلہ طے کرنا ہے۔ اس فاصلے کو طے کرنے ہی وہ چاندی

کا کپ حاصل کر سکتا ہے اور اس طرح وہ سب میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کرے گا۔ لیکن اکبر سوچتا ہے کہ کس کام کا یہ چاندی کا کپ ہو سکتا ہے۔ جبکہ دنیا میں ایسے ہزاروں کپ اقتدار کے بھوکے پاؤں تلے روند لیتے ہیں۔

کب تک جنوبی افریقہ میں سیاہ فام لوگوں کو رنگ نسل کے امتیازات پر سفید ان کو کچلتے رہیں گے۔ انسانیت کا علمبردار کب تک اُن کی حفاظت کے قابل بن سکیں گے۔ کب تک یہ نسلی امتیاز کی دوڑ دنیا میں رہے گی۔ کب تک رنگ کے بنا پر امریکہ جیسے تہذیب یافتہ ملک میں NEGRO کو دوسرے درجے کی شہریت کا حقدار سمجھا جائے گا۔ کیا یہ دوڑ DR KING کو قتل کرنے تک انسانوں کو مجبور کرے گی۔ کیا سچائی کے ان حقیقی علمبرداروں کا یوں ہی خون بہایا جائے گا۔ وہ چیخ پڑا۔

"نہیں۔ اشرف المخلوقات ایسی دوڑ میں شریک نہیں ہونگی۔ ان کو ایسی دوڑوں میں شریک ہونے سے روک لینا چاہیئے!"

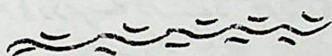
لیکن کالج کی اس دوڑ نے اس کے سامنے دنیا کی دوڑوں کا خاکہ کھینچ رکھا۔ اس خاکے نے اس کو ایک ایسی الجھن میں ڈال دیا وہ سوچ نہیں پاتا۔ وہ جب سے کالج کی دوڑ میں شریک ہوا۔ تو اس کے سامنے دنیا کی دوڑوں کا خاکہ تھا۔ وہ سوچتا رہا کہ

آخر اشرف المخلوقات اپنے آپ کو کہاں تک لے جائے گی۔ لیکن جب وہ کالج واپس پہنچا تو لڑکوں نے تالیاں نہیں بجائی۔ لڑکوں نے اُس کے جیت جانے کی خوشی میں اس کے نام کے نعرے نہیں لگائے۔ آخر یہ سب خاموش کیوں ہیں۔ کسی نے اُس سے کہا۔

"اکمبر تم ہار جاؤ گے کسی کو یقین تک نہیں تھا۔ پھر یہ . . . ."

"میں ہار گیا" وہ بڑبڑایا۔ "میں نہیں ہارا"

ہاں جو بھی زمانے کی اِن الجھنوں کے لئے سوچتا ہے . . . . ہار جاتا ہے۔



سگریٹ

میں نے سگریٹ سلگایا۔ ہاں سگریٹ سلگایا۔ ایک لمبا کش لیا — پھر — پھر — دھواں پھیل گیا۔ میں بڑبڑایا۔
"کتنا اچھا دھواں"۔ پھر چیخ پڑا۔ "نہیں برا ہے"!
پھر مجھے محسوس ہوا کہ دھواں سگریٹ کے ایک کش کے ساتھ باہر آ گیا اور پھیلتا گیا — اس قدر پھیل گیا کہ میں اس دھواں میں قید ہو گیا تھا۔ میں اس دھواں کو چیر کر کے اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں سگریٹ کا کش پر کش لیتا رہا۔ میں جس دھواں میں قید تھا۔ میں اسی دھواں میں کش پر کش لے کر اضافہ کرتا تھا۔ میں بیوقوف ہوں۔ اس لئے میں اپنے آپ ہنس پڑا۔ لیکن میری ہنسی تلخ تھی۔ میں پھر چیخ پڑا۔
"سگریٹ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔ کیا کبھی تو میرے کام آیا۔ تو ہر وقت میری زندگی میں طوفان کا باعث بن گیا"۔
میں نے نفرت سے سگریٹ کو پاؤں کے تلے مروڑ دیا اور ہاتھوں سے اپنے ارد گرد کا دھواں ہٹانے لگا۔ تاکہ میں اس قید سے آزاد ہو

سکوں۔

"لیکن کیا میں اس قید سے آزاد ہو کر دنیا کی قید سے کبھی آزاد ہو جاؤں"۔

یہ میرے لیئے ایک ایسا ہی سوال تھا۔ جیسے موت کب آنے والی ہے۔ اس سوال کو حل کرنے سے پہلے مروڑے ہوئے سگریٹ نے قہقہہ لگاتے ہوئے میری نادانی پر ہنسنا شروع کیا۔ اس قتل کیے ہوئے سگریٹ کی بے وقت کی ہنسی مجھے بری طرح کھٹک رہی تھی۔ میں بڑبڑایا۔

"کمبخت آج سے میں نے تیرے ساتھ رشتہ توڑ لیا"۔

مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے کہہ رہا ہے۔

"تیرا اور میرا رشتہ آسانی کے ساتھ نہ ٹوٹ جائے گا۔ یہ تو پندرہ سال کا پرانا رشتہ ہے۔ یاد ہے تم کو، جب تمہارا اور میرا رشتہ قائم ہوا۔ ان دنوں تم بیس سال کے تھے۔ پانچویں میں پڑھ رہے تھے۔ تم نے میرے ساتھ رشتہ جوڑ لیا۔ چوری چھپے تم میری تلاش کرتے تھے۔ کبھی ابا کی ایش ٹرے سے میرے چھوٹے ٹکڑے منہ میں رکھ کے چھوٹے چھوٹے مگر پیارے پیارے کش لیتے تھے۔ میں کبھی کتنا خوش ہوتا تھا۔ کتنی ہی دفعہ تمہیں میرے لئے مار پڑی، کتنی ہی دفعہ تمہیں میرے لئے اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن نہ تم نے مجھے چھوڑا۔۔۔ اور نہ میں نے تمہیں چھوڑا۔ ہم دونوں کا رشتہ مرتے دم تک قائم رہے گا

اور تم کہتے ہو کہ ٹوٹ گیا ___ اے ___ کیسے ٹوٹ گیا ___ کیوں ٹوٹ گیا؟ مجھے سگریٹ کی یہ بے وقت کی بنسری پسند نہ تھی۔ میں طیش میں آگیا تھا۔

"اے بے وقوف مجھ سے کہتے ہو کہ تیرا اور میرا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا ہے ___ کیا کہتا ہے؟ تیرا اور میرا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ تیری وجہ سے میرے سب رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ یاد ہے تم کو میرا ایک ہی دوست تھا۔ سردار کرپال سنگھ تھا۔ میں اس کو جان سے بھی عزیز رکھتا تھا۔ ایک دن میں نے مذاق میں اس کو تمجھے پینے کی دعوت دی تو پھر وہ آپے میں نہ رہا۔ اس نے کہا۔ ......

"تم نے ایک سکھ کی بے عزتی کی"۔

.... اور دیکھتے ہی دیکھتے برسوں کی دوستی ٹوٹ گئی، ختم ہوئی اور میں دیکھتا رہا۔ جانتے ہو کیوں؟ تمہاری وجہ سے ___ اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں کبھی ایسا بیہودہ مذاق اپنے دوست کے ساتھ نہیں کرتا۔ تیرے ساتھ رشتہ جوڑنے کی وجہ سے میری دوستی قربان ہو گئی۔ پھر وہ قتل کیا ہوا سگریٹ مسکرا پڑا۔

"پھر بھی تمہارا اور میرا رشتہ نہیں ٹوٹ گیا۔ لگتا ہے تمہارا اور میرا رشتہ تمہاری دوستی سے مستحکم اور قوی ہے"۔ میں نے غصے میں اس مروڑے ہوئے سگریٹ کو لات ماردی۔ میں نے کہا۔

"کمبخت ناز کرتا ہے اپنے اس رشتے پر۔ جانتا نہیں ہے کہ اس رشتے نے میرے جذبانوں کی کیا درگت بنائی۔ دل کے سکون کے واسطے اگر میں سکینہ کے ساتھ چند لمحے گزار لیتا تو جلاتا ہوا ہم دونوں کو کیوں تکتا تھا۔ اس لئے کہ ایک دن اُس نے مجھ سے کہا"۔

"سگریٹ چھوڑ دو"۔

"سگریٹ چھوڑ دوں"۔

"ہاں چھوڑ دو"۔ پھر سکینہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا"۔ لیکن اس کا دھواں مجھے پسند ہے"۔

"تمہیں دھواں پسند ہے"۔

"ہاں مجھے دھواں پسند ہے"۔

"تم سگریٹ کو نہیں چھوڑ سکتے ہو"۔ سکینہ نے کھڑی ہو کر مجھ سے جواب طلب کیا۔ میں نے کہا۔

"تم دھواں چھوڑ دو"۔

اُس نے مجبور آواز میں جواب دیا۔

"میں دھواں نہیں چھوڑ سکتی ہوں۔ تم اچھی طرح سے جانتے ہو۔ میں دھواں نہیں چھوڑ سکتی ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں والدین کے خلاف بغاوت کر سکوں"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم دھواں میں اپنا راستہ تلاش کرنے کے لئے تیار نہیں ہو۔

بھلا میں کیسے سگریٹ کو چھوڑ دوں۔ جو کچھ نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے تسکین دے سکتا ہے۔"

سکینہ نے غصّے میں زمین پر لات مارتے ہوئے کہا۔

"تم ضدی ہو۔"

"وہ چلی گئی۔ بہت دور چلی گئی۔ بھلا ایک مفلس افسانہ نگار کے پاس اس کے بڑے خاندان کے حسب ونسب کے لئے کہاں جگہ تھی۔ وہ تو قسم کے کرنل کی بیوی بن گئی۔ اُف میں کیا سوچنے لگا ہوں اب تو یہ پرانی بات ہو گئی ہے۔ شاید چند دنوں اس کا میرا ساتھ رہتا۔۔۔ لیکن اے سگریٹ تجھے کب یہ گوارا تھا۔ تجھ سے تعلقات توڑ کے تجھ سے انتقام لوں گا۔"

نہ جانے میں کیا کیا سوچتا رہا۔ پرانی یادوں نے مجھے ایک بار وہ سب کچھ یاد دلایا جو میں بھول جانا چاہتا تھا۔ جن کو میں بھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن یادوں کو آدمی کیا کرے۔ یہ ذہن میں چلی آتی ہے۔ میرا دماغ اُن کو یاد کر کے تھک گیا تھا۔ میں اپنے اس منگلے سر نے دماغ کو کچھ تر و تازگی دینا چاہتا تھا۔ میرا ہاتھ بے خبری کے عالم میں سگریٹ کی ڈبیہ پر پڑ گیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جلتا ہوا سگریٹ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"ٹوٹ گیا رشتہ۔"

میں نے چاہا کہ اس سگریٹ کو پھینک دوں۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔

صرف اتنا کہہ سکا۔

"یہ رشتہ آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتا ہے۔"

اور پھر سگریٹ کا لمبا کش لیا۔



زنجیر

یہ نہ سمجھئے میں ایک ایسی زنجیر کا تذکرہ کرنے والا ہوں جس کے سہارے ہلیری ایک تنزنگ کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر پہنچ گئے یا جس کے سہارے پرانے زمانے میں انسان ایک خوفناک دریا کو پار کرتا تھا۔ لیکن میں اس زنجیر کا ذکر کر رہا ہوں جو عصا بن کے آپ کو راستہ نہیں دکھا رہا ہو بلکہ جو لاٹھی بن کے آپ کی کمر توڑ کے رکھ دے۔ جناب یہ وہی زنجیر ہے۔ جس سے بڑی بڑی عمارتوں کو گرایا جاتا ہے اور اسی زنجیر کی مرزا غالب کو عمر بھر شکایت رہی۔ مرزا کو عمر بھر اس زنجیر سے نجات نہ ملی۔ زنجیروں کی قسمیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان قسموں میں دو اہم قسمیں ہیں۔ ایک ریشم کی زنجیر ہوتی ہے۔ نرم سڈول، لچکدار اور ہاتھ میں نہ آنے والی یہ زنجیر آپ کو اونچے اور بڑے مکانوں کے علاوہ سوسائٹی کی اہم پارٹیوں اور کلبوں میں تتلی بن کر ملے گی۔ دوسری زنجیر لوہے کی بنی ہوئی موٹی اور مضبوط زنجیر ہوتی ہے۔ ایسی زنجیریں کھیتوں میں گھر کے چولھوں

کے سامنے نظر آتی ہیں۔ یہ زنجیر بڑی شکی ہوتی ہے اور مرد کے اشارے حرکات وسکنات پر بڑی کڑی نظر رکھتی ہے۔ لیکن ایسی زنجیر اس سے بھی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ شکی قسم کی نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی یہ زنجیر مردوں کے لئے ریشمی پھندہ بن جاتی ہے۔ میں نے اپنے دوست کے سامنے ان مختلف قسم کی زنجیروں کا تجزیہ پیش کیا۔ میرے دوست نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"حضور میں ایسی زنجیر ڈلوانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں زندگی بھر شادی نہیں کرونگا۔" مجھے بڑی ہنسی آئی۔ کیونکہ ایسے جواب میری پیٹ میں ہنسی کے بل ڈالنے پر مجبور کرتے ہیں۔ فطرت کے خلاف جو کوئی بھی بات کرتا ہے۔ تو میں یا تو اس کو یا اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف سمجھتا ہوں لیکن میرا عزیز دوست دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف ثابت نہ ہوا۔ چند دنوں کے بعد وہ صبح ہی صبح میرے گھر پر نازل ہوا اور میں نے اُس سے دیکھ کر کہا۔

"حضور صبح ہی صبح کیسے نکل آئے ہو۔"

"جناب ایک خوشخبری لایا ہوں۔"

"خوشخبری!" میں نے حیران نگاہوں سے سوال کیا۔

"جی ہاں خوشخبری . . . . میری . . . . میری شادی ہو رہی

ہے" نہایت ہی شریلی آواز میں اُس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ میں نے لمبی اور گہری سانس لی۔ اُس نے پھر کہا۔

"آپ مجھے مبارک بادی نہیں دینگے"

"ہاں میں تو مبارک باد دینا ہی بھول گیا" میں نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"لیکن تم نے مجھے نہیں پوچھا کہ مبارک بادی کس آواز میں دوں مترنم یا ماتمی آواز میں"

"کیا" اُس نے حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں پیارے اب تمہاری زندگی کی یہ حرکت پر زنجیر پڑ جائیگی" لیکن اس متوالے اور جوشیلے نوجوان پر میری نصیحتوں سے اثر کیا پڑتا؟ پھر تو ایسے جوشیلے نوجوان کو ایک زنجیر کی بھی ضرورت ہوتی ہے اگر اُن کے پاؤں میں زنجیر نہ پڑ جائے تو وہ ایک دیوانے ہاتھی کیطرح نہ جانے کتنوں کو زخمی کر بیٹھے گا۔ خیر میرے پیارے دوست کے ایسے جوشیلے جذبات پر فوراً ہی زنجیر پڑ گئی۔ دو تین مہینوں تک وہ نظر نہیں آیا جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ مجھے ملا۔ ایک شراب خانے میں۔ خیر میرا تو میخانے سے قدیمی رشتہ تھا۔ لیکن اُس نے یہ نیا رشتہ میخانے سے کیسے قائم کیا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا۔

"کیوں بھائی ـــ یہاں کیسے چلے آئے"۔
"چلے آئے۔" اس نے شرابی آواز میں کہا۔ "جیسے تم چلے آئے۔ ایک دن سب چلے آئیں گے اور پھر سب تمہاری اور میری طرح نشے میں جھوم کے ایک نیا رنگ جما رہیں گے۔"
"اے ـــ اے ـــ تم کیا سمجھو گے ـــ جب شادی کرو گے خود ہی سمجھ لو گے پھر تم میرے ساتھ اس میخانے میں رنگ جما دو گے۔" میرے دوست نے کہا۔
میں نے سوچ لیا کہ آخر میرے دوست کی اس زنجیر نے رنگ لایا۔ زنجیر نے میرے دوست کی زندگی کو اجیرن کر دیا۔ دوسرے دن میرا دوست میرے پاس آیا اور ندامت بھرے لہجے میں کہا۔
"میں بہت دنوں سے آپ کو نہ ملا۔ شرمندہ ہوں۔ لیکن کل جس حالت میں آپ کو ملا۔ اس نے مجھے شرمندہ ہی نہ کیا بلکہ ندامت کے گہرے سمندر میں ڈبو دیا۔ لیکن یہ سب کیسے ہوا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ آپ اس بات سے پوری طرح واقف ہیں۔ لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ آپ جیسے رفیق اور شفیق دوست کے مشورے پر میں عمل نہ کر سکا اور اس لئے آج میری زندگی سمندر کے ایک بڑے بھنور میں پھنس کے رہ گئی ہے۔"

میں اس کو دیکھتا رہا۔ اس کی باتیں سنتا رہا۔ لیکن پھر مجھے کچھ یاد آیا۔ میں نے کہا۔

"میرے دوست زندگی بذاتِ خود ایک کھنڈر ہے اور جب کھنڈر ختم ہو جاتا ہے تو زندگی دم توڑ دیتی ہے۔ اس لئے اب میرا یہ مشورہ ہے کہ زندگی کو اس کھنڈر میں رہنے دو۔"

اس نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اسکی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ میرا مشورہ اس کو پسند نہیں آیا۔ ان دنوں وہ میرے پاس اکثر آیا کرتا تھا لیکن پھر مجھے میرا دوست ایک ماہ تک نہ مل سکا۔ اور جب ملا۔ تو اس کا پیلا چہرہ اس بار بشاشت لئے نظر آتا تھا۔ لگتا تھا کوئی خطرناک جنگ جیت کے آیا ہے۔ میں نے اس کی خوشی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"حضور اتنے دنوں میں اپنی زنجیر کو توڑ رہا تھا۔ مجھے مبارک باد دیجئے کہ میں یہ زنجیر توڑنے میں کامیاب ہوا۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے کہا۔

"لیکن اس بار بھی آپ خاموش کیوں رہے؟"

"اس لئے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم دوبارہ زنجیر نہ جوڑ دو گے۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "جی ہاں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ تب آسمان زمین پر گر پڑے گا۔ [illegible]

دم توڑ دے گی"

کہنے کو تو میرے دوست نے بہت کچھ کہہ دیا۔ لیکن کہنے اور عمل کرنے میں اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا بندے اور خدا کے درمیان ہے چھ ماہ تک میرا دوست مجھے ملتا رہا اور ہر دن اُس زنجیر کے بارے میں اپنی ناراضگی کا رونا روتا تھا۔ لیکن پھر اچانک غائب ہوا۔ دو ماہ کے بعد مجھے وہ ایک گلی کے موڑ پر ملا۔ وہ نظر بچا کے میری نظروں سے اوجھل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن میری نظر اس کو کہاں بچنے دیتی۔ میں نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"نقیب صاحب آپ"

"جی ہاں میں ہوں"

"جی میں شرمندہ ہوں۔ اتنے دنوں میں آپ کو نہ مل سکا"

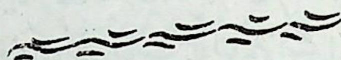
"اس سے زیادہ تم اس بات پر شرمندہ ہو۔ کہ تم پھر اپنے وعدہ پر قائم نہ رہے" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اپنے پاؤں میں نئی زنجیر کب ڈال دی"

"جی ڈیڑھ مہینہ ہو گیا"

تو سچ مچ میرا دوست اپنے وعدے پر قائم نہ رہا۔ لیکن میں کیوں اپنے دوست کو ہی گناہ گار سمجھوں۔ میں جو زنجیر کے خلاف لمبی چوڑی باتیں کیا کرتا تھا۔ ایک دن وہی زنجیر میرے پاؤں میں

بھی پڑ گئی۔ میرے دوست نے کہا۔
"کیوں صاحب یہ کیا ہوا۔"
"وہی ہوا صاحب۔ جو تمہارے ساتھ ہوا۔"
لیکن بات دراصل یہ ہے کہ آدمی اس زنجیر کے بغیر نباہ
بھی نہیں کر سکتا ہے ؛



خدا کون ہے؟

جب جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ ہوتی ہے تو ہاتھ بار بار جیب میں چلا جاتا ہے۔ آدمی کی نفسیات بھی کیا چیز ہے! جب جیب میں پیسہ نہ ہو تو محسوس ہوتا ہے کہ جسم کا کوئی حصہ غائب ہے۔ میرے جیب میں پھر بھی بار بار ہاتھ چلا جاتا ہے اور بار بار یہی محسوس کرتا ہوں کہ میرے جسم کا کوئی حصہ غائب ہو گیا ہے اور ایسے میں لبوں پر ایک دکھ بھری سیٹی آ جاتی ہے۔ میں بھی سیٹی بجانے سے اپنی دھن میں گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک چمکیلے نوٹ پر پڑ گئی۔ میں اداس سیٹی کے ترنم کو بھول گیا۔ میں بڑبڑایا۔

"سو روپے کا نوٹ!"

"نوٹ کو اٹھانے سے پہلے میں نے ارد گرد نظر ڈالی۔ سوچا کہ کہیں کوئی آدمی نہ نکل آئے اور یہ کہے۔

"جناب یہ چوری کا سلسلہ کب سے شروع کیا ہے؟"

لیکن محلے کا یہ کونہ سنسان پڑا ہوا تھا۔ دور دور تک کوئی نہیں

چل رہا تھا۔ میں نے جھک کر سو روپیہ کا نوٹ اٹھایا۔ مجھے اب تک یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سو روپے کا نوٹ تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"آج خدا بہت جلد میری حالت سے واقف ہوا۔ ورنہ وہ اکثر سویا پڑا رہتا تھا۔" میں تو اب خیالات کی گرفت سے آزاد ہو کر عملی زندگی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں سو کے نوٹ کی بہت قیمت ہے پھر ایسے آدمی کے لئے جس کی تنخواہ دو تین سو ہو اور بہت بڑا کنبہ ہو۔ اس لئے سو روپے کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذہن میں ایک نیا پروگرام تشکیل دینے لگا اور اسی نئے پروگرام کے بارے میں سوچتے ہوئے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں گھر کے اندر داخل ہونے ہی والا تھا کہ دماغ کے کسی گوشے سے آواز آئی۔

"یہ سو روپیہ کا نوٹ ہے نا؟"

"ہاں" میں بڑبڑایا "کسی کا بھی ہو لیکن اب میرا ہے۔"

"تیرا" میرا ذہن میرے اس جواب پر ہنس پڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے "یہ تیرا نہیں ہے۔ یہ اُس کا ہے جس کا تھا۔"

"نہیں اب یہ میرا ہے۔"

"نہیں یہ اُس کا ہے جس کا تھا" میرا ذہن چیخ کر کہتا ہے "صرف ایک سو روپیہ پا کے سب کچھ بھول گئے۔ بھول گئے کہ اگر یہ سو روپیہ

کسی بچے نے کھو دیا ہوگا۔ تو اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ جانتے ہو کیا ہوگا"؟

"کیا ہوگا"؟

"وہ خوف کے مارے گھر میں داخل نہیں ہوگا۔ وہ بھاگ جائے گا اور نہ جانے کن کن مصیبتوں کا اس کو مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اگر وہ ہار جائے گا تو شاید زندگی سے بھی ہاتھ دھو دے گا"۔

"نہیں" میں چیخ پڑا۔

جانتے ہو کون اس کی موت کا ذمہ وار ہوگا — تم ہی رہو گے — ہاں تم — جو صرف ایک سو روپیہ کے لئے لالچی بن گیا"۔

میرے سامنے بچپن کا وہ زمانہ یاد آ گیا۔ جب میں بھی ایک بچہ تھا۔ میں نے اس زمانے میں پانچ روپے کا نوٹ کھو دیا تھا۔ جس کے لئے والد نے مجھ پر طرح طرح کی اذیتیں ڈھائیں اور یہ ایک سو روپیہ کا نوٹ ہے۔ مجھ میں جو لالچ کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اب وہ کافور ہو گیا۔ میں نے خود سے کہا۔

"مجھے اس بچے کو ڈھونڈنا چاہئے۔ جس نے یہ ایک سو روپیہ کھو دیا"۔

میں اسی گلی کی طرف روانہ ہوا جہاں میں نے تھوڑی دیر پہلے ایک سو روپے کا نوٹ اٹھایا اور میں بے پناہ خوشی میں ڈوب گیا۔ سوچا تھا شاید وہ بچہ سو روپیہ ڈھونڈ رہا ہوگا۔ لیکن گلی اب

بھی خاموش تھی۔ لیکن اب یہ سو کا نوٹ میرا سکون منتشر کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہ جانے کہاں کھو گیا یہ بچہ"

میں گم سم کھڑا ہر طرف اپنی نظر دوڑا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہر طرف دھواں پھیل رہا ہے۔ لالچ کا دھواں اور میں اُس دھوئیں میں قید ہو گیا تھا۔۔ پھر اچانک اُس دھوئیں میں ایک روشنی کی کرن آگئی اور دھواں ہٹنے لگا۔ وہ کرن تھی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی۔ جو زمین پر بڑے غور کے ساتھ کچھ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن اُس کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اچھی خاصی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے کپڑوں کو دیکھ کر میرے دماغ میں پھر ایک نیا خیال کوند گیا۔

"آہ۔۔ اگر اس آدمی کو سو روپیہ مل بھی نہ جائے تو کیا ہوگا۔ یہ آدمی اچھی خاصی پوزیشن والا لگتا ہے"۔ یہ خیال آتے ہی میں اس سو روپیہ کو خرچ کرنے کے لئے ایک پروگرام تشکیل کرنے لگا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"ابھی تو مہینے کے دس دن باقی ہیں۔ سگریٹ پر بیس روپے خرچ ہوں گے۔ منی کے لئے دس روپے میں جوتا آئے گا۔ بہت دنوں سے بجلی فیس بھی ادا نہیں کی۔ اس لئے بجلی محکمہ نے ہماری بجلی کا کنکشن کاٹ دیا۔ بجلی فیس کے چالیس روپے بھر کے بہت

دنوں کے بعد بجلی کی روشنی میں اخبار پڑھنا نصیب ہوگا۔ پھر بھی چالیس روپے بچ جاتے ہیں ۔۔۔ اب یاد آیا۔ بہت دنوں کے بعد میں اپنے دوست امتیاز کے ساتھ انگریزی وسکی پی لوں گا۔

میرے ذہن نے سو روپے کو خرچ کر لینے کا سارا پروگرام مرتب کیا تھا۔ اب تو میں گھر کی طرف جانے لگا۔

لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا یہ آدمی ... ڈھونڈ رہا ہے یا کچھ اور۔ میں نے ادھیڑ عمر آدمی سے کہا۔

"آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"میں" اس آدمی نے کھوئے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"بھائی صاحب تھوڑی دیر پہلے میں یہاں پیشاب کرنے بیٹھا اور میری جیب سے سو روپے کا نوٹ گر گیا۔"

میں نے طنزیہ آواز میں کہا۔

"لیکن بھائی اب وہ نوٹ آپ کو کہاں ملے گا۔"

"ہاں یہ تو صحیح ہے۔" اس نے دکھی آواز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس نوٹ کو میرے پاس واپس آنا ہی چاہیئے۔"

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

اس آدمی نے سنجیدہ آواز میں جواب دیا۔

"بھائی صاحب میں غریب آدمی ہوں۔ حاجت پڑ گئی۔ ایک آدمی سے سو روپیہ اُدھار لیا۔ جب میں اُس آدمی سے کہوں گا کہ میرا سو روپیہ کھو گیا۔ تو وہ یقین نہیں کرے گا۔ اُس کو میری نیت پر شک ہو گا۔"

میں بُت بن کر اُس آدمی کی باتیں سُن رہا تھا۔ جس کی حقیقت میرے سامنے کُھل گئی تھی۔ اُس آدمی نے آگے کہا۔

"بھائی صاحب میری بیٹی کی شادی ہو رہی ہے اور مجھے اس سو روپے سے کچھ چیزیں لانی تھیں۔"

اُف — میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک سو روپیہ میں ایک بیٹی کی شادی پر خرچ کرنا بہتر ہو گا یا وِسکی اور سگریٹ پر خرچ کرنا بہتر ہو گا۔ میرا دل چیخ پڑا۔

"نہیں — نہیں مجھے اس آدمی کو یہ سو روپیہ واپس لوٹا دینا چاہیئے۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے اُس آدمی سے کہا۔

"یہ تو نہیں ہے آپ کا سو روپیہ۔"

اس آدمی نے کہا۔

"سو روپیہ کا نوٹ یہ ضرور ہے۔"

میں نے کہا۔

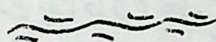
"جی ہاں یہ سو روپیہ کا نوٹ ہے اور آپ کا ہے۔ لیجیئے اپنا

یہ سو کا نوٹ۔"

اُس آدمی نے سو روپیہ کا نوٹ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لے کر کہا۔

"آپ تو اس وقت میرے لئے خدا بن گئے۔"

خدا کون ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔



پتھر کا زخم

خیالوں کے لئے ایک عمر ہوتی ہے۔ یہ عمر بھی خاص ہوتی ہے اور خیال بھی خاص ہوتے ہیں۔ رینو کے پاس بھی خیال تھے۔ خیال جو عمر کے مطابق آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ رینو نے عمر شباب کو چھو لیا۔ عمر شباب جو بہت ساری باتیں اپنے ساتھ لاتی ہے۔ تو بہت ساری پیچیدگیاں بھی ساتھ آتی ہیں۔ رینو جو بچپن سے اب تک تھی ویسی رہنا چاہتی تھی۔ عجیب لڑکی تھی ــــ عجیب خیالات تھے اس کے۔ عمر تو اُس سے اور کچھ تقاضا کر رہی تھی۔ نینا اُس کی سہیلی تھی۔ وہ کہتی۔

"عمر آئی ہے جب کچھ ہونے والا ہے۔"

رینو چیخ پڑی۔ "ہرگز نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہوگا۔"

تب نینا ہنس پڑی۔ اُس نے کہا۔

"عمر وہ چلی گئی جب بچوں جیسی باتیں کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ زندگی کے اصولوں پر عمل کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔"

لیکن رینو اپنے فیصلے پر سختی سے پابند تھی - وہ کہتی۔
"میرے پتھر جیسے مجسمہ پر کوئی زخم نہیں کرے گا"
نینا پھر ہنس پڑی - کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رینو کے فیصلہ میں حقیقت کا کوئی نشان نہیں ہے - رینو کیا سوچتی تھی اور سوچ کر کہاں کھو جاتی تھی - نینا کے لئے ایک معمہ تھا - زخم اُس کے ذہن کے لئے الجھن بن گیا تھا - یہ ایک ایسی الجھن تھی - جس نے اُس کے ذہن کو بے حس بنا دینا تھا - یہ ایک ایسی الجھن تھی جو اُس کی جوانی کی حرارت سرد کر رہی تھی - اُس کا ذہن اکثر اُس سے کہتا تھا -
"کاش میں عورت نہ ہوتی - میں مرد ہوتی - تب نہ جانے کیا ہوتا؟"
ایک ایسا احساس انسانی ذہن کو پاگل کر دیتا ہے اور پاگل ذہن کچھ بھی کر سکتا ہے - جوانی کا طوفان اور بھی طوفان اپنے ساتھ لاتا ہے - حالانکہ رینو کی جوانی میں حرارت نہ تھی - جہاں حرارت نہیں ہوتی وہاں ایسی سردی ہوتی ہے جو جم کر برف بن جاتی ہے - برفیلی شخصیت کڑوی ہوتی ہے یا کڑوا پن اس کی فطرت کا ایک حصّہ بن جاتا ہے۔
رینو کی ماں نے رینو سے کہا۔
"وہ آ رہے ہیں"
"کون؟"

ماں نے اُس کے گال پر چپت مارتے ہوئے کہا۔
"تجھے آج لڑکے والے دیکھنے آ رہے ہیں"۔
رینو یہ سُنکر چیخ پڑی ۔۔۔ اُس نے کہا۔
"ماں اُن کو کہدو کہ وہ نہ آجائیں اور کوئی گھر تلاش کریں"۔
ماں بُت بن کر کھڑی ہوئی۔ وہ حیرت سے اپنی بیٹی کو تک رہی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
"کیوں بیٹی کوئی اور لڑکا تیری نظر میں ہے؟"
اس کی ماں نے اُس کے دل کی بات معلوم کرنے کے لئے اندھیرے میں تیر چلایا۔ رینو نے کہا۔
"نہیں ۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو عمر بھر اپنی ماں کے پاس رہنا چاہتی ہوں"۔
ماں نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔
"لیکن بیٹی لڑکی کو ایک دن پرائے گھر جانا ہی پڑتا ہے۔ یہ دُنیا کا اصول ہے"۔
اس کی ماں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"ضد مت کرو بیٹی"۔
لیکن رینو نے سنجیدہ آواز میں کہا۔
"لیکن ماں یہ میرا اٹل فیصلہ ہے"۔

رینو کی ماں کو معاملہ کی نزاکت یہ کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ اس وقت سمجھوتہ کرے۔ اس نے کہا۔

"اچھا تو جو چاہتی ہے وہی ہوگا۔ لیکن اس وقت ہم لوگوں نے اُن کو یہاں بُلایا ہے۔ مہمان کی تو بہر حال عزت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے تم ان لوگوں کے سامنے چائے کی ٹرے لے کر آنا۔ پھر میں اُن لوگوں سے کہونگی کہ ہمیں اُن کا لڑکا پسند نہیں آیا۔"

رینو نے کچھ سوچتے ہوئے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن یہ اب فیصلہ ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی۔"

اس کی ماں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وقت کی رَو اس کی بیٹی کے خیالات کو پاش پاش کرے گی۔ مہمان لوگ آگئے تھے۔ اور رینو وعدے کے مطابق چائے کی ٹرے لے کر آگئی۔ سدیش کی ماں نے رینو کو اپنے پاس بٹھا کر کہا۔

"بہت ہی خوبصورت ہو تم بیٹی۔ بھگوان تمہیں سُکھ دے۔"

اُس بوڑھی عورت کی باتیں رینو کے جسم کی نس نس میں چنگاریاں بھر رہی تھیں۔ لیکن وہ اپنے آپ پر قابو کئے تھی۔ شکر یہ تھا کہ لڑکا نہیں آیا تھا۔ ورنہ شاید رینو قابو میں نہ رہتی۔ رینو کے جانے کے بعد رینو کی ماں نے سدیش کی ماں سے کہا۔

"آپ نے کہا تھا کہ لڑکا بھی آ رہا ہے۔"

"بہن اب کیا بتاؤں۔ وہ لڑکا کہتا ہے کہ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔" نہ جانے آج کل کے ان لڑکوں پر کیسا بھوت سوار ہوا ہے۔

رینو کی ماں نے کہا۔ "نہیں بہن یہ بھوت نہ صرف لڑکوں پر سوار ہے بلکہ لڑکیاں بھی اس کی شکار ہو گئی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں بہن میری لڑکی نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں کہی ہیں۔ کیوں نا ہم لڑکی اور لڑکے کو ملا لیں گے۔ مجھے امید ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر شادی کرنے کیلئے تیار ہوں گے۔"

"بہن — مجھے آپ کی بات کے ساتھ اتفاق ہے۔"

پھر وہ دونوں مل کر منصوبہ بنانے لگے۔ دوسرے دن رینو کو ممیا نے کہا۔

"بات چل پڑی۔"

"بات!" رینو نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا بات چل پڑی ہے؟"

رینو نے خوفناک آواز میں کہا۔

"نہیں میری شادی نہیں ہوگی۔"

"آ — ہا — بھولی کیا بن رہی ہو۔ تمہارا باپ وہاں شادی کی

تیاری میں لگا ہوا ہے اور یہاں تم شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہو"۔
رینو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے غصہ بھری آواز میں کہا۔
"میں اس وقت پوچھ لوں گی ممی سے کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے"۔
"بی بی ہم احمار پارک میں ہوا خوری کے لیے آئے ہیں کسی لڑائی کی ریہرسل کرنے نہیں آئے"۔
اُس وقت نینا نے ایک بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"وہ بھی یہاں ہے"۔
"کون؟"
"وہی جس کے ساتھ تمہاری شادی ہو رہی ہے"۔
"کیا بک رہی ہو؟"
"جی ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ سامنے بیٹھا ہوا ہے"۔
"اچھا!" رینو کھڑی ہو کر بولی "میں ابھی اس آدمی کا حساب چکتا کر لوں گی"۔
نینا ہنس پڑی۔ رینو نے زمین پر لات ماری اور لڑکے کی جانب بڑھی۔ لڑکے کے پاس پہنچ کر اُس نے لڑکے سے کہا۔
"اے مسٹر"!
لڑکے نے اپنا سر کتاب سے اٹھایا۔
"جی آپ نے مجھ سے کہا"!

"آہ ــــ ہا ــــ باتیں ایسے کرتے ہو جیسے مجھے جانتے ہی نہیں ہو۔ لیکن مسٹر یہ خیال دل سے نکال لو کہ تم مجھ سے شادی کرو گے۔ میں کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہوں"۔

رینو نے یہ سب باتیں ایک ہی سانس میں بتا دیں۔ اب لڑکے نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"رینو دیوی میں بھی شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں شادی کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ لیکن میں کسی کو یہ بتا نہیں سکتا"۔

رینو چیخ پڑی۔ اُس کا دماغ چکرایا۔ لیکن وہ سنبھلی اور اُس کو کچھ یاد آیا۔ ہاں وہ یاد آیا جو وہ بھول گئی تھی یا وہ جو بھولنا چاہتی تھی یا جس پر وہ پردہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اور اگر میں بھی شادی کرنے کے قابل نہ ہوں تو اس حالت میں ہم دونوں کا ساتھ کیسا رہے گا"۔

سدلیش حیران نظروں سے رینو کو تکنے لگا۔ اُسی شام رینو نے ماں سے کہا۔

"میں شادی کرنے کے لئے تیار ہوں"۔



وعدہ

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

یہ شعر گنگنا کے میرے دوست نے میری طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔

"حقیقت ہے اس میں کچھ۔"

"آ"

"عجیب آدمی ہو تم۔"

"عجیب آدمی ہوں میں۔"

میں نے واپس جواب دیا۔ "نہ جانے مجھے کیا ہوتا ہے کہ میں اُلٹے سیدھے جواب بک لیتا ہوں۔ میں اب سوچنے لگا ہوں کہ واقعی میں ایک عجیب آدمی ہوں۔ ایک ایسا آدمی ہوں جو ہر بار اپنے راگ میں کھویا رہتا ہے۔" اکثر مجھ سے میرا دوست پوچھتا ہے۔

"ہوا کیا ہے تجھے؟"

میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں۔ پھر میں اپنے دوست کے چہرے کو دیکھتا ہوں۔ جو خوشی سے سرشار تھا ــــ میں بڑبڑاتا ہوں۔

"اقبال تمہیں تو سب کچھ ملا ــــ اور ــــ مجھے تو کچھ بھی نہ ملا۔"

اقبال اور میں جس راستے پر جا رہے تھے۔ اس کے دونوں طرف قبرستان تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہر قبر سے باہر ایک روح آئی اور جو فریاد کر رہی ہو۔ تب میں نے اپنے دوست سے کہا۔

"شاید مرزا غالب نے یہ شعر قبرستان کو دیکھ کر کہا ہوگا ؎

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

میرے دوست نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاید ــــ لیکن اس پر مجھے پورا یقین ہے کہ ساحر نے یہ شعر شاہجہاں کی قبر کو دیکھ کر کہا ہوگا ؎

"جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا

روکے زمانہ چاہے روکے خدائی ....

.... تم کو آنا پڑے گا"

یہ شعر سن کے مجھ پر وحشت طاری ہوئی۔ ایک ایسی وحشت نے مجھ پر یلغار کیا کہ میں بے تحاشہ دوڑنے لگا اور دوڑتا رہا۔ میرا دوست پکارتا رہا۔

"امجد ... امجد ... امجد۔ رک جاؤ۔ کہاں جارہے ہو؟"
لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اپنے دوست کی
چیخ و پکار سنتوں۔ میں دوڑتا رہا۔ زمانے نے مجھ سے کہا۔
"کہاں جانا ہے نہیں؟"
"کہاں جانا ہے تجھے؟"
فوراً مجھے یاد آیا کہ میں ممتاز کو ڈھونڈ رہا ہوں۔
میں چیخ پڑا۔ "ممتاز"۔
میری نظر تو اس قبر پر پڑی۔ جہاں ممتاز سوئی تھی۔ جہاں
ایک سیاہ پتھر کے نیچے ممتاز کے ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔
"ممتاز —— میری بیوی —— کہاں ہو"
مجھے سب کچھ یاد آیا۔ میں نے جب شاہ جہاں بن کر ممتاز
کے ساتھ شادی رچائی۔ میں نے سمجھا تھا کہ ہم دونوں اپنے دلوں
میں محبت کا تاج محل تعمیر کریں گے۔ ایک ایسا تاج محل جو شاندار
ہوگا۔ کیونکہ ہم ایک بادشاہ کی طرح یہ تاج محل دولت کے سہارے
نہیں بنا سکتے۔ لیکن یہ ایک جھوٹا خواب تھا۔ ایک ایسا خواب
جس میں حقیقت بہت دور بھاگ رہی تھی۔ میرے خواب چکنا چور
ہوئے —— اُف —— اُف تم وہ نہ ثابت ہوئی جو میں نے تجھے سمجھا
تھا۔ پھر ہم دونوں اُس کشتی میں سوار ہوئے۔ جس نے منزل چھوڑ

دی تھی اور منجدھار بن آگئی تھی - اب میں کیسے تمہیں چھوڑ دیتا - میں تو خوشیوں کا محل تعمیر نہ کر سکا - تو ـــ کیا ہوا - پھر بھی ایک سہارا تھا - جو کھوکھلا سہی ـــ لیکن تھا ـــ شاید تمہیں یہ معلوم نہ تھا کہ میں ایک اور ممتاز کی تلاش کرنے نکلا تھا - رضیہ شاید ممتاز ہی تھی - اُس کی بڑی بڑی اور معصوم آنکھیں یقین دلا رہی تھی کہ میں ہی تمہاری ممتاز ہوں - پھر وہ مجھ سے کہتی -

" شاہجہاں چھوڑ دو سب کو اور چلے آؤ اپنی ممتاز کے پاس - ہم دنیا سے دور اپنا تاج محل بنا دیں گے - جہاں میں ہوں گی تم ہو گے "

لیکن میں کیسے تمہیں چھوڑ دیتا - جس کو میں نے ممتاز سمجھا تھا - جس کو میں نے شاہجہاں بن کر محبت دی - لیکن قدرت نے تمہیں دوسرے جہاں میں لینے کا ارادہ کیا - میں نے لاکھ چاہا کہ تم قدرت کے جلال میں نہ آؤ - لیکن کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا -

" تمہاری ممتاز تو رضیہ ہے "

پھر موت نے اپنا مُنہ کھولا - لیکن موت کو دیکھکر تُو ہنس پڑی - جیسے موت سے کہہ رہی تھی -

" جا ـــ بھاگ جا ـــ یہاں سے "

لیکن وہ بھاگنے والی نہیں تھی - تم نے مجھ سے کہا -

" اب میں جا رہی ہوں ـــ لیکن وعدہ کرو کہ تم کبھی نہیں

کرو گے ۔ وعدہ کرو"۔ تم پاگل ہو گئی تھی یا موت نے تم کو پاگل کر دیا تھا
نہیں آخر ہوا کیا تھا کہ تم نے مجھ سے ایسے وعدے کا تقاضا کیا۔ لیکن
تم میں ایسی کونسی طاقت آ گئی تھی۔ جو مجھے کہہ رہی تھی ۔۔۔ "وعدہ کرو،
وعدہ کرو"۔۔۔ کیا میں اپنی ممتاز کو حاصل نہیں کروں گا۔ یہ میرے لئے
سوال تھا۔ ایک ایسا سوال جس میں میری خوشی کا راز پنہاں تھا۔ پھر
ایک آدمی نے میرا کندھا دبایا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ شاید
وہ تمہارا بڈھا باپ تھا۔ جس نے مجھ سے کہا۔

"مرنے والی کی آخری خواہش پوری کرو"۔

میں پاگل تھا ۔۔۔ جی ہاں ایک پاگل ہی اپنا ہاتھ بڑھا کر یہ کہے گا۔
"ممتاز میں وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر دوسری شادی نہیں کروں گا"۔

پھر ۔۔۔ اس کے ساتھ موت کا کھلا ہوا منہ بند ہو گیا۔ تیری
روح تیرے جسم کو چھوڑ کر چلی گئی اور میں دیکھتا رہا۔

لیکن بہت جلد مجھے یاد آیا کہ تم نے میرے کندھوں پہ میرے ضمیر پہ
اور مجھ پر ایسا بوجھ رکھا۔ جس کو میرے کمزور ہاتھ ہٹا نہ پاتے ہیں ۔ ظالم
بن کر تو نے میرے پاؤں میں وہ زنجیر ڈال دی کہ میں ممتاز حاصل نہ کر
سکا۔ اس دن مجھے سارا جہاں جلتا ہوا محسوس ہوا۔ جب مجھے کسی نے کہا۔

"شاہجہاں کی ممتاز کو کسی اور نے عقد میں لے لیا ہے"۔

میں کچھ نہ کر سکا۔ صرف دیکھتا رہا۔

اب بیا تمہارے قبر کے کالے پتھر سے کہتا ہوں۔
"تو ظالم ہے ـــــ جلاد ہے۔ تو نے میری خوشیاں چھین لیں۔ کیا حق تھا تمہیں میری خوشیاں چھین لینے کا۔"
میں جنوں میں تھا ـــــ میں نے پھاوڑا اٹھالیا۔ ممتا کی قبر کو کھودتے ہوئے کہنا لگا۔
"میں تجھ سے انتقام لوں گا۔ تجھے اس سکھ کے ساتھ قبر میں رہنے نہیں دوں گا۔"
مجھ پر وحشت کا عالم طاری ہوا تھا۔ میں جنونی ہوگیا تھا۔ میرا دوست اقبال ہانپتے ہوئے میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ میرے اس جنون کو دیکھ کر چیخ پڑا۔
"کیا ہوا ہے تمہیں۔"
"کیا ہوا ہے مجھے؟"
میری اس جنونی حالت کو دیکھ کر ہم دونوں کے ارد گرد چند لوگ بھی جمع ہو گئے۔ ان سب لوگوں نے ملکر میری وحشت پر قابو پایا۔ وہ لوگ آپس میں کہہ رہے تھے "پاگل ہے۔"
اگر وہ مجھے پاگل سمجھتے ہیں تو ان کو سمجھنے دو۔ دوست اقبال سمجھتا ہے کہ بیوی کی موت نے مجھ کو یہ حالت بنا دی ہے تب میں چیخ کر کہنا چاہتا ہوں۔ سب سے کہنا چاہتا ہوں ـــــ "میری یہ حالت صرف ایک وعدے نے بنا دی۔"

تقدیر

تقدیر کا لفظ جب کوئی میرے سامنے بولتا ہے۔ تو میرے کان کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لفظ کے ساتھ مجھے چچا غالب کا یہ شعر بھی یاد آتا ہے

"دہر میں نقش وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ شرمندۂ معنی نہ ہوا"

بقول غالب وفا کا لفظ کبھی شرمندہ معنی نہ ہوا۔ لیکن تقدیر کے لفظ کے ساتھ کچھ الٹا ہی معاملہ وابستہ ہے۔ میرے خیال سے ازل سے اس لفظ کو شرمندگی خفت اور ذلالت کا بوجھ اٹھانا پڑا ہوگا۔ اب دیکھئے اس بدبخت لفظ کا جو بھی ذکر کرتا ہے تو یوں کرتا ہے۔

"بیچارے کے والد چل بسے — تقدیر میں لکھا تھا"۔

"وہ دیوالیہ ہو گیا ہے۔ تقدیر بیچارے کی تقدیر"۔

کوئی کنواری لڑکی شادی سے پہلے کسی ایرے غیرے کے ساتھ رشتہ جوڑ لیتی ہے اور پھر جب وہ کنواری ماں بن جاتی ہے۔ تو اس کی ماں لمبا سانس لیتے ہوئے کہتی ہے۔

"یہ دن ——— تقدیر میں لکھا تھا"

کرے ایسے کرتوت خود اور کوسے تقدیر کو۔ اس دنیا کا یہ الٹا قانون ہے۔ اب دیکھئے کوئی دو تین سال میں بہت بڑا تاجر بن جاتا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا ہے۔

"تقدیر کا یہ تماشہ دیکھو"۔

بس اس وقت سب کے لب پر ایک ہی بات ہوتی ہے۔

"اجی حضرت یہ غیر معمولی قابلیت رکھتا ہے"۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ بھی تقدیر کا ایک تماشہ ہے۔ لیکن صاحب کوئی بھی تقدیر کے یہ تماشے دہرانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ کمبخت لفظ تقدیر کے حصے ذلالت اور حقارت کے سوا کچھ اور آیا نہیں ہے۔ خود میں کبھی اس لفظ کا اس قدر بڑا دشمن تھا کہ میری زبان اس کو گالیاں دیتے ہوئے تھکتی نہیں تھی۔ جب سکول کے دنوں میں میری پنسل یا کتاب کھو جاتی تھی۔ شامت کیا آ جاتی تھی اس لفظ کی۔

حضور اس نادان بندے کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے یوں کہیے، اس حلقے میں سب قسم کے لوگ موجود ہیں۔ کوئی شاعر ہے تو کوئی ادیب ہے تو کوئی مسخرہ ہے۔ میرے ان دوستوں میں مسخرہ دوست ہی کبھی کبھی پتے کی بات بتا دیتا تھا۔

ایک دن ہم نافہم دوستوں کا یہ چھوٹا سا خاندان ادبی اور بے ادبی

دونوں قسم کی گفتگو کر رہا تھا۔ کئی صاحب کہہ اٹھتے تھے۔
واللہ بھائی کیا چال ہے اس کی؟ کیا ہونٹ ہیں اُس کے؟ کیا قد ہے اس کا؟—
شاعر صاحب کہہ اٹھتے تھے۔
"دوستو میں چچا غالب کے اس شعر کا اب تک مطلب نہ جان سکا۔

"میری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا"

فلسفی صاحب اپنا نکتہ لے کر سامنے آجاتے تھے۔
"میں —— میں ہوں —— آخر یہ ہوا کیا؟"
محفل میں اُس دن جان نہ تھی۔ کیونکہ ہمارے ببکل صاحب غیر حاضر تھے۔ خدا نے ہمارے دل کی آواز سن لی اور ببکل صاحب دوڑے دوڑے ہمارے پاس آگئے۔ اُن کے ماتھے سے صاف نظر آرہا تھا کہ غصہ حملہ آور ہوا تھا۔ میں نے کہا۔
"کہئے صاحب آپ اب تک کہاں رہے؟"
میرا صرف اتنا کہنا کہ شکایتوں کا ایک لمبا دفتر کھل گیا۔ اُس نے جھنجھلاہٹ دار آواز میں کہا۔
"حماقت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ جہالت کی بھی کوئی سرحد ہوتی ہے ہر

وقت بس یوں ہی بکے جاتے ہیں۔ الٹا سیدھا جو کچھ زبان سے نکالا۔ بس نکالا ہی ـــــ زبان نہ ہوئی کو نقارہ ہوا۔" میں نے اس کی لمبی تقریر پر بریک لگاتے ہوئے کہا۔

"بیکل صاحب جس چیز کی وجہ سے آپ کو اپنی روح میں سوئیاں ٹھونستی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ذرا وہ بیان کیجئے"۔ بھلا ہو بیکل کی زبان کی جس نے پھر اختصار سے کام لیا۔

"آجی حضرت وہ میرے چاچا ہے نا ـــ اپنے آپ کو عالم دہر سمجھتے ہیں۔ محترمہ اہلیہ بیمار ہو گئی۔ اس کی بیماری کا باعث اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے بن گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ بچہ چنچل ہے۔ اس لئے جب تک لوہے کے ہتھیاروں کے بغیر باہر آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ خیر یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ میں تو چاچا کو تسلی دینے لگا۔ لیکن چاچا کے دماغ کو دیکھئے، کہنے لگے۔ "بیٹا تقدیر کی بات ہے"۔ میرے دوستو خود چاچا نے یہ کام کیا اور دوش تقدیر کو دیتا ہے۔ لفظ تقدیر کی یہ بے حرمتی مجھ سے برداشت نہ ہوئی۔ آخر یہ انسان اپنے ہر ایرے غیرے کام کو تقدیر کا سہارا لے کے تقدیر کے لفظ کو کیوں بدنام کرتا ہے"۔ آگے بیکل صاحب نے کہا۔ "دوستو اس غلط قسم کے رجحان کے خلاف ہمیں لڑنا ہے۔ انسانی ذہن کو صاف ستھرا کر کے اس کے ستھرے معنوں میں اس لفظ کا صحیح مطلب چسپاں کرنا ہے"۔ مجھے اپنا بچپن یاد آیا۔

ہر چھوٹی بات کو ایٹم بم میں تبدیل کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ STRIKE پر STRIKE کرنا تو ہماری عادت بن گئی تھی۔ میرے دماغ میں ایک پُرانا نقشہ نکل گیا۔ میں نے کہا۔ "لیکن ہیکل صاحب تقریروں سے کام نہیں چلے گا۔ انسانی ذہن کے اس رجحان کو ختم کرنے کے لئے اور اس لفظ کو صحیح مقام دلانے کے لئے ہمیں ایک انجمن قائم کرنی ہوگی۔"

میں نے اپنی تقریر ابھی پوری نہ کی کہ شاعر صاحب کہہ اٹھے۔

"ضرور —— ضرور —— یہ انجمن قائم ہونی چاہیئے۔ انقلاب جب تک نہ ہو۔ بات ہی نہیں بنتی ہے۔"

ہیکل نے بھی میرے اس خیال کی تائید کی۔ لیکن ہمارے فلسفی دوست اور مفکّور کو میری یہ تجویز پر ایسی قے کی کہ ان کی اور ہماری دوستی کی رسی ٹوٹ گئی۔ وہ کہہ پڑے۔

"ہمارے خیالات سے کمیونزم کی بُو آرہی ہے۔ ہم خون خرابہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

اس میں سچائی ہے کہ اگر وہ دونوں خاموشی سے نہ چلے جاتے تو خون خرابہ ہو ہی جاتا۔ لیکن بھلا ہو ان کا کہ وہ خاموشی سے رخصت ہوئے میں نے اپنے ناداں غصّے پر قابو پا کے عزیز ادیب عقل دوست ہیکل سے کہہ پڑا۔

"اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کتابچے تقسیم

کرنے ضروری ہیں اور اس کے لئے ایک فنڈ کمیٹی بھی وجود میں آنی چاہیئے۔"
میرے دونوں دوستوں نے اس تجویز کو سراہا۔ مجھ "نااہل" کو "تعمیر انجمن" کا صدر میرے ان دوستوں نے چن لیا۔

حضور پھر میرے یہ دو دوست فنڈ جمع کرنے نکلے۔ کوئی گیارہ آنے گیارہ پیسے جمع ہوئے تھے۔ انجمن کی اقتصادی حالت خراب تھی لیکن پبلسٹی زوروں پر چالو تھی۔ چھ سات روپے اپنی جیب سے نکال کے ایک کتابچے میں یہ کہا کہ انسان کا اخلاق سدھارنے کے لئے تعمیر کمیٹی وجود میں آئی۔

خیر عوام کو کوئی پتا خرچ نہ کرنا چاہیئے۔ سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ ہوا یہ کہ مخالف پارٹی اور حکمران پارٹی دونوں اس نام نہاد تعمیر کمیٹی دلچسپی لینے لگیں۔

حکومت ہم کو اپنی غرض کے لئے استعمال کرنا چاہتی اور مخالف پارٹی اپنی غرض کے لئے۔ لیکن ہم ٹھہرے اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہم نے دونوں کو اپنے پیٹ کے لئے استعمال کیا۔ اب اکثر تینوں دوست ہوٹلوں میں کباب اور شراب اڑاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ میرا ہیکل دوست اب جلوہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ جلوے بھی دیکھے۔ کبھی ایک بازو میں گندمی رنگ کی لڑکی رہتی تھی۔ کبھی دوسرے بازو میں گوری رنگ کی لڑکی رہتی تھی۔ والدین کو ہماری نیت پر اکثر شک ہوتا تھا۔ ان سے

کہتے تھے۔

"امی یا ممی ابا یا ڈیڈی ہم youth کا ذہن Revolutionise
کر کے اُن کو نئی اخلاقی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کا اندرلیس دیتے ہیں۔"
حضور ہمارے بھولے بھالے والدین ہماری ذہنیت اور اپنی نادانی پر ناز
کرتے تھے۔

لیکن یہ سلسلہ کب تک چلتا رہنا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی محکمہ ہماری
حقیقت جاننے کے لئے کمر کس کے پیچھے پڑا تھا۔

حکومت نے جب سمجھا کہ یہ پارٹی دونوں پارٹیوں کا مال اُڑا کے
اپنی ہی دھن میں کھوئی رہتی ہے۔ تو ہماری اس اخلاقی اور تقدیر پارٹی
کو توڑنے کے منصوبے سوچنے لگی۔

لیکن تقدیر پارٹی اس قدر مشہور ہو گئی تھی کہ ان کو ڈر تھا کہ کہیں
لوگوں کا غنڈا طبقہ بغاوت نہ کر بیٹھے۔ اس لئے عقل اور کام لئے بنا نہ چلتا۔
ہمارے دوست شاعر جو تھا۔ اُس کی شاعری میں زیادہ ذکر ٹٹی کا
ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو چند اشعار سے

گاتا ہوں او گاتا ہوں
ٹٹی پاس میں پاس میں
پاس دل میں
منزل دور سہی
جانا ضرور ہے۔

ہمارا دوست تھا۔ اس لئے واہ! واہ!! ہا! ہا!! کرنا تو ہمارا فرض تھا۔ کبھی کبھی میں بے اختیار بول اٹھتا تھا۔

"اس میں فلسفہ کی نانی پنہاں ہے۔" اچھے خاصے ماہنامے والے اچھی شاعری کو خدا حافظ بولتے تھے۔ لیکن حکومت نے جہاں ہماری تقدیر حماقت کمیٹی کو ختم کرنے کے لئے جلاد کی تلوار نکالی تھی۔ وہاں پہلا وار ادب پر پڑا۔ ادب کے نام پر غلاظت کو ادب کا سرچشمہ کا نام دے کے چھاپ لیا گیا۔

یہ کتاب چھپی کیا کہ ہمارے شاعر دوست نے کہا کہ تقدیر حماقت انجمن دراصل ایک ڈھونگ ہے، فریب ہے۔ یہ تو بیرونی ملکوں کے ساتھ ملی ہوئی جماعت ہے۔ حالانکہ بیرون اور اندرون ہم کبھی جان ہی نہ پائے ہیں۔

بیکل صاحب نے نئی ہوا کو آتے دیکھا تو وہ بھی حکومت کی جوتیوں کی پالش کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ سرخ سیاہ پالش نے رنگ لایا۔ وہ مقامی سکول میں استاد کیا نے کہ میری انجمن کو دشمن عناصر قرار دے کر کہا۔

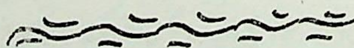
"مجھے اب تک اس بات سے بے خبر رکھ لیا تھا۔ دراصل تقدیر حماقت کمیٹی بیرونی ملکوں کا ایک خفیہ اڈہ ہے۔ جب شاعر عظیم سرچشمہ ادب نے اس بات کا انکشاف کیا تو میں حقیقت جاننے کیلئے

بیقرار ہوا۔ بالآخر حقیقت معلوم کر کے ہی اس انجمن کا ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا"۔

میں نے دل سے کہا کہ چلو اچھا ہی ہوا کہ ان نا اہل دوستوں کی حقیقت کھل گئی۔ لیکن نا اہل دوستوں کے ان بیانات نے مجھے جیل کی اندھیری کوٹھری میں ڈال دیا۔ مجھے یہ الزام لگایا گیا کہ یہ قوم دشمن عناصر کے ساتھ کام کرتا ہے۔ چھ ماہ کی قید ہوئی۔ فوراً زبان پر آ گیا۔

"تقدیر اپنی بری ہے"۔

جی ہاں حقیقت بھی تو ہے تقدیر کے لئے۔ اتنا کچھ کیا اور تقدیر نے ہی ساتھ نہ دیا۔



ایک کرن ایک موتی

موتی کیچڑ میں پڑا ہوا تھا۔ وہ پیدا بھی ہوا تھا اسی کیچڑ میں۔ اس کے والدین۔ اُس کے رشتہ دار اور اُس کے آس پاس والے اُسی کیچڑ میں اُس کے ساتھ رہ رہے تھے —— وہ اپنے آپ سے اکثر کہتا تھا۔

"بھلا میں موتی کہاں ہوں۔ میں تو کیچڑ میں پڑا ہوں۔"

لیکن اس کو کیا معلوم تھا؟ —کہ —— موتی اکثر کیچڑ میں ہی پڑا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات ہے کہ اس کو دیکھنے کے لئے ایک جوہر شناس آنکھ ہونی چاہیئے۔ وہ آنکھ چاہے جو کہ یہ سمجھ لے۔ وہ اصلی اور سچا موتی ہے۔

اور کرن کیچڑ میں نہیں بلکہ آسمان پر ہوتی ہے۔ کرن تو آسماں سے زمین پر چلی آتی ہے۔ لیکن وہ تو سورج کی کرن ہے اور یہ کرن تو آسماں کے ساتھ باتیں کرتی ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ عالیشان مکان میں رہتی ہے۔

وہ آسماں پر —— اور موتی —— موتی زمین پر —— بھلا

اِن میں کیا مناسبت ہے۔ لیکن موتی کے خیالات کو ـــــ جذبات کو ـــــ کون روک سکتا ہے۔ پھر اس کے پاس ایک انسانی دماغ ہے وہ دماغ تو موتی کا دماغ تھا۔ جو ہر بات کا تجزیہ کرتا ہے اور ہر تجزئے میں نئی بات پاتا ہے۔ غریب کے پاس دنیا داری سکھ نہیں ہوتا ہے۔ اس کے خیالات ہوتے ہیں۔ اس کے جذبات ہوتے ہیں۔ موتی نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ جہاں پر پیدائش ہی سے کمانے کا سبق دیا جاتا ہے۔ موتی نے ماحول سے بغاوت کی۔ ماحول کے اصولوں سے ـ اُن قدروں سے۔ اُن تقاضوں سے۔ پھر وہ بغاوت کب تک ساتھ دیتی۔ میٹرک کے بعد تقاضوں کا یہ سلسلہ اسقدر بڑھ گیا کہ اُس کو اپنے آپ کو تقاضوں کے حوالے کرنا پڑا۔ پھر وہی جدو جہد کی ایک لمبی دوڑ شروع ہوئی۔ ایسی دوڑ جہاں آدمی گر بھی جاتے ہیں۔ زخمی بھی ہوتے ہیں۔ پھر بھی جدو جہد کی دوڑ ختم نہیں ہوتی۔ دم نہیں توڑتی۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر میں۔ دوسرے دفتر سے تیسرے میں ـــــ آخر ایک دفتر کے آفیسر نے کہا۔

"ستر روپے کی کلرکی ملے گی ـــ کرو گے ؟"

"نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے ـــ میں تو ایسا کام کرنے کے لئے آیا ہی ہوں"۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کل سے کام پر آجاؤ"۔

وہ دوسرے دن سے کام پر آیا۔ پھر وہ ہر دن کام پر آتا رہا۔ تقاضے ٹھنڈے پڑے یا یوں کہئے کہ تقاضوں نے راستہ بدل لیا۔ صرف سستی ردیوں سے ان تقاضوں نے راستہ بدل لیا۔ لیکن احساسات مر نہیں جاتے ہیں۔ جذبات ٹھنڈے نہیں ہو جاتے ہیں۔ وہ شعور اور لاشعور کے خلا میں اٹک کے رہ جاتے ہیں۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ کام کرتے رہتے ہیں۔ دماغ کی وسعتیں سکون ڈھونڈنے کے لئے سرگرداں رہتی ہیں۔ وہ الجھنوں میں پڑا ہوا تھا۔ وہ ان الجھنوں سے فرار کا راستہ ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ پھر ایک سریلی آواز نے موتی کو فرار کا راستہ دکھایا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "مسٹر — آپ کو معلوم ہے — مسٹر ورما — ایڈووکیٹ کا گھر کہاں ہے؟"

موتی نے اس جوان لڑکی کو غور سے دیکھا۔ جس کے پاس قدرتی حسن کے علاوہ ایک قیمتی ساڑھی بھی تھی۔ ایک قیمتی ساڑھی کی تعریف میں نہ جانے کیوں موتی ایک قصیدہ پڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کو فوراً یاد آیا کہ لڑکی نے اس سے کوئی سوال پوچھا تھا۔ اس نے کہا۔

"آئیے میں دکھاتا ہوں آپ کو مسٹر ورما کا گھر۔ وہ حال ہی میں یہاں رہنے آئے ہیں۔"

وہ خاموشی سے ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلنے لگے۔ موتی آگے اور لڑکی اس کے پیچھے۔ موتی خاموشی پسند نہیں کرتا تھا۔ یا تو پھر

دماغی خیالات کا بہاؤ ـــــ ایک لڑکی کے ہوتے ہوئے دماغ پر کب اختیار رہتا ہے اور پھر خاموشی ۔ خاموشی موت کو کہتے ہیں ۔ موت کو ــ "موتی توڑ دو اس خاموشی کو" ۔ اس لئے موتی نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

"کسی کے خلاف کیس دائر کرنا ہے"۔

"نہیں تو ۔" لڑکی بھی ہنس پڑی ۔ "نہیں تو ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ مسٹر ورما ایڈووکیٹ تو میرے چچا ہیں"۔

"بڑے آدمی کی بیٹی ہو ۔" موتی نے سنجیدگی سے کہا ۔

"کہاں ہوں ؟ ـــ میں تو ایک چھوٹے آدمی کی بیٹی ہوں"۔

"آپ کا باپ کیا کرتا ہے؟"

"لو اب تم حسب و نسب پوچھنے لگے" ۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

"میرے پتاجی دہلی دو ڈھائی سو روپے کی کلرکی کرتا ہے"۔

"کلرک ہیں وہ ۔" موتی نے کہا ۔ "لیکن آپ کی یہ قیمتی ساڑھی تو بڑے باپ کی بیٹی ہونے کی داستان سنا رہی ہے"۔

"اسٹوپڈ تم بھی دھوکا کھا گئے نا ۔ یہ تو میرے چچا نے جنم دن پر تحفہ دیا دی ۔"

موتی زور سے ہنس پڑا ۔ ہنستے ہوئے اس نے کہا ۔

"مجھے ایک کہانی یاد آئی ۔ سن لوگے ۔ بڑی دلچسپ کہانی ہے"۔

"تم کہانیاں بھی لکھتے ہو۔"

"ہاں" موتی سنجیدہ ہوا۔ "ہاں جب دماغ پر قابو نہیں رہتا جذبات بہنے نکلے جاتے ہیں۔ احساسات ایک طوفان کی طرح مجھے اپنے گرہ میں لیتے ہیں۔"

"جو کہانی احساسات۔ جذبات اور انسانیت کی ترجمانی کرتی ہو۔ وہ اچھی کہانی ہونی چاہیئے۔ مجھے فنکاروں سے عقیدت ہی نہیں محبت بھی ہے۔ ذرا سناؤ تم اپنی کہانی۔"

"ایسی کہانیاں صرف شروع ہوتی ہیں۔ اختتام کی چوٹی کو چھو بھی نہ پاتی ہیں۔" ورما کا گھر آ گیا۔ لڑکی نے کہا۔

"تمہاری کہانی بہت اچھی ہے۔ لیکن میں پوری نہ سن پائی۔ کسی رسالے میں کیوں نہ چھپواتے ہو۔ ماہنامہ "بندھن" کو بھیج دو۔"

"کیا چھاپ لیں گے؟" موتی نے سوال کیا۔

"کیوں نہیں؟ ــــ اچھی اور معیاری کہانیاں کو چھاپ دینا چاہیئے۔"

"اچھا ــ آپ نے کہا تو روانہ کر دیتا ہوں۔ لیکن نہ آپ نے اپنا نام بتایا۔ نہ میں نے ہی اپنا۔ میرا نام موتی کشن ہے۔ بجلی محکمے میں کلرک ہوں۔"

"میرا نام کرن ہے۔" لڑکی نے کہا۔ "میں بی۔ اے میں پڑھ رہی

ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔"

کرن ورما کے مکان میں داخل ہوئی۔ موتی نے کرن کو جاتے ہوئے دیکھا۔ کرن نے کہا تھا۔

"تمہاری کہانی اچھی ہے۔"

موتی نے سوچا۔

"کرن نے کہا ــــ وہ روشنی تھی۔ مجھے ماہنامہ "نبدھن" کے ایڈیٹر کے پاس خود جانا چاہیئے۔"

تھوڑی سی ہمت افزائی آدمی کو بہت دُور تک لے جاتی ہے۔ لیکن موتی دُور تک نہیں گیا۔ وہ صرف ماہنامہ "بندھن" کے دفتر تک گیا۔ اتفاق سے موتی کو ماہنامہ کا سب ایڈیٹر ملا سلام کر کے موتی نے کہا۔ "جناب ایک کہانی لایا ہوں۔"

"کہانیاں تو بہت لاتے ہیں۔ لیکن معیاری بہت کم ہوتی ہیں۔" سب ایڈیٹر نے کہا۔ "پھر بھی تم اپنی کہانی پڑھ کر سنا دو۔"

موتی نے زندگی کے بنے ہوئے ایک جال میں پھنسے ہوئے آدمی کی روداد پیش کی۔ وہ کہانی نہیں تھی۔ حقیقت تھی۔ نہیں یوں کہیئے کہانی ہو کر بھی گمان یہ ہوتا تھا کہ وہ ایک حقیقت تھی۔ کہانی ختم ہوئی لیکن اب تک کہانی کا تاثر ماحول میں رچا ہوا تھا۔ ایک ایسا تاثر جس نے سب کو خاموش کر دیا۔ سب ایڈیٹر نے آخر کہا۔

"تمہاری کہانی واقعی ایک متاثر کن کہانی ہے۔"

"شکریہ۔"

تم کہانی کو یہاں چھوڑ دو۔ چھپ جائے گی۔

"بہت ـــ بہت ـــ شکریہ۔"

اس وقت موتی نے اپنے آپ کو دنیا کا خوش ترین آدمی تصور کیا۔

. . . . اس خوشی میں مگن وہ سب ایڈیٹر کے دفتر سے نکلا۔ لیکن وہ کسی سے ٹکرا گیا۔ وہ کرن تھی۔ موتی نے کہا۔

"اوہ معاف کیجئے۔"

ارے تم تو وہی ہو ـــ نا ـــ جو ـــ مجھے ـــ ہاں ـــ ہاں ـــ ورما صاحب کا مکان تم ہی نے مجھے دکھایا ـــ اچھا اب یاد آیا۔ تم اپنی کہانی لے کر آئے ہوں گے یہاں۔"

"جی ہاں۔" موتی نے آگے کہا "اور آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی۔ کہ میری کہانی عنقریب ہی شائع ہو رہی ہے۔"

"واقعی خوش قسمت ہو۔ تمہیں پہلی باری پہلی کہانی چھاپ لی گئی۔"

"یہ سب تو آپ کی وجہ سے ہوا۔" موتی نے ممنون ہوتے ہوئے کہا۔

"میری ـــ وجہ ـــ وہ کیسے۔" کرن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کتنی کہانی اچھی ہے ۔ تو میں نہ جانا ماہنامہ "بندھن" کے دفتر پر"
"اوہ"۔
"کرن دیوی میں اس خوشی میں آپ کو چائے پلانا چاہتا ہوں"۔
"چائے" کرن نے کہا۔
"ہاں ــــ انکار نہ کیجئے"
موتی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ انکار نہ کر سکی ۔ یہ سلسلہ چائے پر ختم نہ ہوا ۔ یہ چائے اس سلسلے کی ابتداء تھی ۔ نہ جانے وہ دونوں کہاں تک چلے ۔ کتنی دور تک چلے ۔ ایک نئی آہنگ لئے اور نیا سوز اور موسیقی کا عجیب و غریب ترنم لئے بڑھتے ہی گئے ۔ ایک دن موتی نے کرن سے کہا۔
"کرن سوچتا ہوں میں نے تمہیں پا کے کچھ کھو دیا"
"ہاں کھو دیا"
"کیا؟" موتی نے معلوم کرنا چاہا۔
"تم کہانیاں نہیں لکھتے ہو"
"اوہ ــــ کرن ــــ تم نے واقعی مجھے یاد دلایا ۔ ہاں میں بھول گیا تھا"
"اب نہ بھول جانا"

اُس صبح اُس نے نئے موضوع پر قلم اٹھایا۔ لیکن ڈاکیے نے دستک دی۔ اُس نے خط کھولا۔ یہ تو اُس کی پہلی کہانی تھی۔ لکھا تھا۔

محترمی!

ہم آپ کی کہانی شائع کرنے سے معذور ہیں۔

سب ایڈیٹر

بی۔ ایل۔ بھوشن

موتی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اُس نے قلم توڑ دیا۔ نئے موضوع پر لکھے ہوئے چند اوراق پھاڑ ڈالے۔ وہ چیخ اٹھا۔ "سب ایڈیٹر، تو نے اُس دن کہا تھا۔ کہانی چھپ جائے گی۔ جھوٹ کیوں کہا۔"

لیکن ادب میں بھی ایک عجیب فطرت کام کرتی ہے۔ لیکن موتی ایک حساس دل رکھتا تھا۔ درد سے آشنا اور غم سے بھرا ہوا دل رکھتا تھا۔ اُس کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔ کرن نے جب اس کو دیکھا اُس نے کہا۔

"کیا ہوا تمہیں آج موتی۔"

"کرن میں نے کہانیاں لکھنا چھوڑ دی۔"

"کیا کہتے ہو۔" کرن نے جواب طلب کہا۔ "لیکن ایسا کیوں۔"

"کرن ماہنامہ "بندھن" کے سب ایڈیٹر نے میری وہ پہلی کہانی واپس کر دی۔" موتی نے ٹوٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اُف ــــــ تم اسی لیے ہمت ہار گئے۔ لاؤ وہ کہانی کہاں ہے۔"
"تم کیا کرو گی، اس کہانی کو۔"
"وہ ماہنامہ "بندھن" میں چھپ جائے گی۔ "بندھن" کے ایڈیٹر میرے ڈیڈی کے گہرے دوست ہیں۔"
اور اس بار تو واقعی موتی کی کہانی "بندھن" میں چھپ گئی۔ کرن کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھتے ہوئے موتی نے کہا۔
"کرن تو نے واقعی کمال کر دیا۔"
"میں نے تو کمال نہیں کیا موتی۔ یہ تو تمہاری کہانی ہے۔ جس نے کمال کیا۔"

پھر ہر دن موتی کے نام پرستاروں کے خطوط آنے لگے۔ بیشمار خط۔ ان خطوں نے اس کے جذبۂ شوق کو ایک نئی قوت عطا کی۔ وہ کہانیاں لکھتا رہا اور کرن کے ہاتھ میں دیتا رہا۔ موتی نے ایک دن کرن سے کہا۔
"کرن آج میں یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوں۔ موتی جو کل تک کیچڑ میں پڑا ہوا تھا۔ آج لاکھوں دلوں کا ترجمان ہے۔"
"لیکن موتی تم یہ بھول رہے۔ کہ یہ تمہاری کہانیاں ہیں۔ جس نے تمہیں اس قدر مقبول بنا دیا۔"
تھوڑے ہی عرصے میں موتی صف اول کے ادیبوں میں شمار

ہونے لگا۔ لیکن اس کی سب تخلیقات ماہنامہ "بندھن" میں چھپ گئی تھی۔ آج وہ اپنی بہترین تخلیق خود "بندھن" کے ایڈیٹر کو دینا چاہتا تھا۔ "بندھن" کے قد آور مکان کو دیکھ کر وہ اندر داخل ہوا۔ موتی نے چپراسی سے کہا۔

"ایڈیٹر صاحب ہیں"۔

"ہاں ہیں"۔

"میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں"۔

"جائیے مل آئیے"۔

وہ ایڈیٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ ایڈیٹر صاحب کھڑکی کے پاس کھڑا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ موتی نے کہا۔

"ایڈیٹر صاحب"۔

وہ پیچھے مُڑ گئی۔

"کرن"!

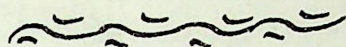
ہاں موتی میں ہی "بندھن" کی ایڈیٹر ہوں۔ میرے ڈیڈی ایک سال پہلے فوت ہوئے اور پھر مجھے ایڈیٹری کی کرسی سونپ دی گئی"۔

موتی کچھ سوچ رہا تھا۔ کرن نے کہا۔

"لیکن موتی تم کیا سوچ رہے ہو"۔

"کرن" موتی نے سنجیدہ آواز میں کہا۔ "میں سوچتا ہوں کہ

ایک موتی کو اگر ایک کرن نہ مل جاتی۔ تو وہ بھی اور ہزاروں موتیوں کی طرح کیچڑ میں دم توڑ لیتا۔"



وقت اور رنگ

ٹیگور ہال کا وہ مشاعرہ ادب نواز لوگ کبھی نہیں بھول سکتے ہیں۔ میری مختصر نظم کی بھی بہت تعریف کی گئیں۔ چند لوگوں کو اس نظم نے اس قدر متاثر کیا کہ ان لوگوں نے مجھے گھر پر دعوت پر بلایا۔ ان حضرات میں سیٹھ کھجور چند تھے۔ تیس سال کے یہ سیٹھ ...... اب تک کنوارے تھے یوں تو وہ اول درجے کے امیروں میں وہ گنا جاتا تھا۔ سیٹھ کی دعوت میں نے قبول کی۔

جب میں سیٹھ کی شاندار حویلی میں داخل ہوا۔ تو میں نے سیٹھ سے کہا۔

"حضور یہ ایک چھوٹی حویلی نہیں بلکہ ایک بادشاہ کا محل خانہ ہے"۔ کھجور چند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس آپ کی عنایت ہے"۔

"اجی میری کیا عنایت ہے۔ آپ پر تو خدا کی عنایت ہے۔ میں نے آپ کو بلا کسی محنت کے اتنی بڑی جائیداد کا مالک اس کم عمری میں بنایا"۔

سیٹھ کھجور چند زندہ دل آدمی تھے۔ میرے ان جملوں پر زور زور سے ہنسنے لگے۔ پھر اس نے کہا۔

"حضور آپ کو انقلابی شاعر کہتے ہیں۔"

"سیٹھ صاحب میں نے حقیقت بیان کی۔ پھر بھی اگر حقیقت کا نام انقلاب ہے تو مجھے انقلابی شاعر پکارنے میں کوا عتراض نہیں ہے۔"

.... یہ کہتے ہوئے ہم دونوں ایرانی قالینوں سے سجائے گئے ایک بہت بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے کے ساتھ ایک اور کمرے سے کچھ جانوروں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں بڑبڑایا۔

"اس شاندار حویلی میں جانور کہاں ہوں گے۔ شاید میں وہم میں پڑ گیا ہوں۔"

لیکن پھر وہی آوازیں آئیں۔ ان آوازوں کے ساتھ میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں نے سیٹھ صاحب سے کہا۔

"اجازت اگر ہو تو میں یہ کمرہ دیکھ لوں۔"

"پہلے آپ شربت پی لیجئے۔ پھر دیکھ لیجیے۔"

شربت کا گلاس میں نے ایک ہی سانس میں خالی کیا۔ سیٹھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چلئے میں دکھاؤں گا آپ کو وہ کمرہ۔"

سیٹھ جی یہ کہہ کر آگے چلنے لگے۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا۔ تو میں نے سمجھا کہ میں کسی چڑیا گھر میں دھوکے سے گھس گیا۔ وہاں ایک سفید کبوتر لوہے کے پنجرے میں تھا۔ ایک کتے اور ایک مرغی کے علاوہ چندن کی الماری میں چھوٹی سی بھر خاردار مال تھی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے دم بخود رہ گیا۔ سیٹھ کھجور چند نے مجھ سے کہا۔

"کیوں شاعر صاحب آپ کہاں پہنچ گئے؟"

"کہیں"۔ میں نے کہا "میں تو یہاں ہی ہوں۔ لیکن آپ نے یہ چڑیا گھر کیسے بنایا؟"

"کیا کہا آپ نے؟" سیٹھ کرسی پر بیٹھے کہ مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ اس کو میری بات سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔

"آپ نے میری محبت کی توہین کی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو دکھ ہوا۔" میں نے معذرت کرتے ہوئے آگے کہا۔

"لیکن آخر ان سب چیزوں کو اکٹھے کرنے کا کیا مطلب ہے؟"

"کیا بتاؤں —— یہ محبت کی لمبی کہانی ہے۔"

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"محبت اور یہ چیزیں —— حضور مجھ جیسا لفظوں میں کھو جانے والا شاعر اس کمرے کو دیکھ کر نہ جانے کہاں کھو گیا۔"

"شاعر" کھجور چند نے ہلتے ہوئے جواری کی طرح کہا "تم اس کہانی کو سننا چاہتے ہو۔ جس کو میں نے کسی سے اب تک نہ کہی۔ اُف شاعر پرانی باتیں یاد دلا کر میری زندگی کے زخموں کو نہ کریدو۔"

پھر وہ خاموش ہوا۔ اُس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کشمکش میں پڑ گیا۔ پھر اُس کی کھوئی ہوئی آواز میرے کانوں میں آگئی۔

"محبت ـــ محبت ـــ آخر یہ محبت کیا ہے۔ ایک ہی بار میں نے تو اُس کو دیکھا۔ پھر مجھ پر یہ جذبۂ محبت کیوں حملہ آور ہوا میں کیسے اس کے گندمی رنگ کے حسین چہرے کو بھول سکتا ہوں۔ لیکن حسن کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ دیکھ لے کہ کوئی اُس کی راہ میں کھڑا تھا۔ وہ کپڑے کی دوکان سے باہر آئی۔ اپنی کار میں سوار ہو کے چلی گئی۔ وہ چلی گئی اور میں اکیلا کھڑا رہا۔ وہاں سڑک پر صرف ایک سرخ رومال تھی۔ حسن کی رومال۔ میں نے حسن کی رومال کو اٹھایا اور آنکھوں سے لگایا۔ اس لئے میں نے اُس رومال کو اپنی چندن کی الماری میں سجایا۔ یہ رومال مجھے یقین دلا رہی ہے کہ حسن آئے گا اور ضرور آئے گا۔"

سیٹھ خاموش ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ لوگ سچ مچ اپنے پاس دل رکھتے ہیں۔ میری طرح کوئی پتھر نہیں ـــ محبت کے اس چھوٹے واقعہ نے سیٹھ کی زندگی کو تبدیل کر کے رکھا ہے۔ میں نے کہا۔

"واقعی آپ کی کہانی متاثر کُن ہے۔ لیکن یہ کتا، یہ کبوتر، یا یہ مرغی...."
"ان کے ساتھ بھی یہی وابستگی ہے"
"کب سے؟"
"کب سے.... شاعر ایک نظم لکھو۔ میرے عشق کی یاد میں ـــ لکھو ـــ لکھو"

میں سوچتا رہا کہ اس بے ہنگم موٹے سیٹھ کو کوئی حسینہ کیسے پلکوں میں چھپا لیتی۔

میں کشمیر کے دلفریب مقامات کی سیر کرتے گیا۔ کبھی پہلگام کے سبزہ زار اور کبھی جھیل ڈل کی ہواؤں نے مجھے مدہوش کیا۔ لیکن ہر وقت میرا ذہن سیٹھ کی وہ پُرتکلف دعوت نہ بھولا۔ جو اُس نے میرے اعزاز میں دی تھی۔ اس لئے سرینگر سے روانہ ہونے سے پہلے میں سیٹھ سے الوداعی سلام ادا کرنے کے لئے اُس کے گھر گیا۔

میں سیٹھ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُس کمرے میں جا پہنچا جہاں سیٹھ کا چڑیا گھر تھا۔ لیکن میں حیران ہوا۔ وہاں نہ کبوتر تھا، نہ کتا تھا، نہ مرغی تھی اور نہ سرخ رومال تھی۔ وہاں پر چندن کی الماری میں اب صرف ایک پھٹی ہوئی چپل تھی۔ جس کو بار بار میں عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے مجھے یقین نہ آتا تھا

کہ وہاں پر صرف ایک پھٹی ہوئی چپل پڑی تھی۔ سیٹھ کا نوکر دوڑتا ہوا میرے سامنے آیا۔ اُس نے کہا۔

"بابو جی آپ تشریف رکھیے۔ میں شربت لاتا ہوں۔ سیٹھ جی آتے ہی ہوں گے"۔

میں نے اُس سے کہا۔

"یہ چڑیا گھر کہاں گیا؟ اور یہ چپل کیسے آئی ہے؟"

"کیا آپ سیٹھ کو نہیں جانتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"سیٹھ نے اپنی بیوی کو اس لئے طلاق دی....."

"کیا؟"

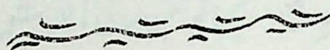
میں چیخ پڑا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔

نوکر نے آگے کہا۔

"کیونکہ وہ اُس کی محبوبہ نہ بن سکی۔ اور اب اگر سیٹھ کی طرف کوئی لڑکی ہنس کے دیکھ لیتی ہے۔ تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ لڑکی اُس کی محبوبہ بن گئی اور اُس لڑکی کی کوئی نہ کوئی نشانی اٹھا کر لیتے ہیں۔ چند دنوں کے لئے اُس کو یہ امید بندھ جاتی ہے کہ وہ لڑکی اپنی باہیں پھیلاتے ہوئے اس کے پاس آئے گی۔ لیکن

بہت جلد وہ اس لڑکی کو بھول کر دوسری لڑکی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح تھوڑے سے ہی وقت میں یہ کمرہ کئی رنگ بدلتا ہے۔

سیٹھ کے اس انوکھے کردار نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں کبھی سیٹھ کے نوکر کو دیکھ رہا تھا کبھی سیٹھ کی محبوبہ کی چھپٹی ہوئی چپل کو۔



آغوش

صنفِ نازک کی مختلف آغوشوں میں آدمی پل کر جوان ہوتا ہے۔ بچپن میں ماں کا آغوش مل جاتا ہے۔ پھر بہن آغوش آدمی کو بالغی سے ہمکنار کرتا ہے۔ پھر اُس کو محبوبہ کی آغوش ملتی ہے اور اُس آغوش میں بہت کچھ پانا چاہتا ہے۔ اقبال قسمت کا مارا تھا۔ پیدا ہوا تو ماں موت کے مُنہ میں چلی گئی۔ پھر اس کو کبھی بچپن میں کسی اور عورت کا آغوش نہ ملا۔ وہ تو ہم جنس کے ہاتھوں بالغ ہوا۔

اس لئے عورت کی آغوش اُس کے لئے معمّہ بن کے رہ گئی تھی۔ جب وہ کالج میں اپنے کلاس میں بیٹھ کر اپنے کلاس کے طلباء پر نظر ڈالتا تھا۔ تو اس کی نظر صرف لڑکیوں پر جا کے ٹھہرتی تھی۔ تب اُس کے دماغ میں ایک سوال آتا تھا۔

"میں ایک بچہ بن جاؤں۔ پھر ان کے آغوش میں جاؤں"

دوسرے لمحے وہ اپنا سر ہاتھوں میں پکڑتا تھا اور خود ہی

اپنے اس بچگانہ خیال پر شرمندہ ہوتا تھا۔ لیکن وہ اپنے دل کو کیا کرے جو رضیہ سلطانہ اور شکیلہ کو دیکھ کر اس خواہش کا اظہار کرتا تھا۔ وہ اپنے اس خیال سے تنگ آگیا تھا۔ اس دماغ نے ایک صلاح دی۔

"شادی کرو۔"

اب یہ بھی اقبال کے نئے مسئلہ تھا کہ وہ کس سے شادی کرے۔ خدا خدا کر کے اس کے انتخاب نے سلطانہ کو چن لیا۔ اقبال نے اس کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کے لئے حیلے دھیلے تراش لئے۔ ایک دن سلطانہ حساب، کا سوال حل نہیں کر سکی۔ اس نے اقبال سے کہا۔

"آپ نے کل والا حساب کا سوال کیا؟"

اقبال تو ایسے موقعے کی تلاش میں تھا۔ اس نے والپس کہا۔

"جی ہاں ـــ میں نے وہ سوال حل کیا ہے۔ آیئے دیکھ لیجئے"۔

سوال دکھاتے دکھاتے اس نے سلطانہ کو محبت کے رنگوں کا قوس قزاح بھی دکھا لیا۔ محبت کا اظہار کیا دونوں اس رنگ میں کھو گئے اور ایک دن اقبال نے سلطانہ سے کہا۔

"میں دنیا کی تمام خوشیاں تمہاری گود میں ڈال دینا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہارے تمام دکھ اپنے آغوش میں سما لوں گی"۔

اقبال سلطانہ کی آغوش میں بیٹھ جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔
نہ جانے کہاں سے یہ خیال آیا۔

"کیا کر رہے اقبال - یہ تمہاری محبوبہ ہے - کوئی کھیلنے کا تماشہ نہیں ہے۔"

یہ خیال آتے ہی اس کے تمام ارادے پسپا ہو گئے - اس کو محسوس ہوا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے زندگی کی عزیز ترین خواہش کا قتل کیا۔ وہ ساری رات اس کے لئے بے اضطرابی کی رات تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کی تمام خواہشات اور تمام اصول اس آغوش کے سامنے دم توڑ لیں گے۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

وہ چیخ پڑا - پھر وہ سوچنے لگا کہ آخر کیسے وہ اپنی اس انوکھی خواہش پر قابو پائے گا - اس کے دماغ نے کہا۔

"اس الجھن کا صرف ایک حل ہے۔"

"کیا؟"

"شادی کرو۔"

اس نے اپنے دل کے ساتھ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی خواہش کا اظہار اپنے والد سے کرے گا - اور اس نے ایسا کیا بھی؟ والد سے کہا۔

"ابا جان میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کا باپ اسی دن کے لئے زندہ تھا کہ کب اس کا بیٹا شادی کرے گا اور پھر وہ سکھ کے ساتھ مر جائے گا۔ اس نے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹے میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔ ہے تمہاری نظر میں کوئی لڑکی؟"

"جی ہاں ایک لڑکی ہے۔"

اقبال نے سلطانہ کا سارا اتہ پتہ بتا دیا۔ سلطانہ کے والدین کو اس شادی سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شادی ہو گئی۔ اپنی حسین دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے اقبال نے کہا۔

"اُف ــــ یہ حسن لگتا ہے، دنیا کا سارا حسن تم میں سمٹ کر آیا ہے۔"

سلطانہ نے شرارت بھری آواز میں جواب دیا۔

"اور یہ سارا حسن تمہارے آغوش میں سمٹ جائے گا۔"

اقبال اپنے دل میں چیخ پڑا۔

"پھر وہی آغوش ...... آغوش ...."

لیکن اب تو اس کے پاس سب کچھ ہے۔ پھر کبھی آغوش اس کے لئے اُلجھن کیوں بنی ہوئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس کو آغوش ملی تھی۔ لیکن اس آغوش میں اس کو وہ سب کچھ نہ تھا جس کی تلاش میں وہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو ایسا آغوش ملے جو اس کے لئے پچپن

کا جھولا بنے۔ لیکن سلطانہ اس کی بیوی تھی۔ کوئی بچپن کا جھولا نہ تھی۔
اس کا دماغ پھر الجھن میں پھنس کے رہ گیا۔

"آخر کہاں ملے گا مجھے وہ جھولا"۔

یہ اس کے لئے الجھن تھی۔ ایک ایسی الجھن جس نے اس کا جینا دوبھر کیا۔ وہ ہر لمحے اپنی اس الجھن کے لئے حل حاصل کرنے کی تلاش میں رہتا تھا۔

ایک دن اس کے دوست امتیاز نے اس سے کہا۔

"یار اس کی شہرت تمام شہر میں پھیل گئی۔ تہلکہ مچایا ہے اس نے۔ لیکن تو وہاں نہیں جا سکتا ہے۔ تم نے تو شرافت کا جامہ پہن لیا ہے۔ اب تو تم بیوی سے ڈرتے ہو۔ جاؤ بھی جاؤ"۔

اقبال طیش میں آ گیا۔ ایسے طیش میں کہ اس نے امتیاز سے کہا۔

"کون ڈرتا ہے اپنی بیوی سے۔ چلو میں بھی دیکھوں اس چیز کو جس نے تہلکہ مچایا ہے"۔

لیکن جب اقبال اس بازار میں داخل ہوا۔ تو وہ بے تحاشہ واپس بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک عورت سے ٹکرا گیا۔ عورت نے کہا۔

"بچے تم کیوں بھاگ رہے ہو"۔

اقبال اس تیس سال کی عورت کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس

نے کہا۔

"جی میرے دوست امتیاز نے مجھے یہاں لایا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے اس بازار میں لے آئے گا"

عورت نے اقبال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آؤ میرے ساتھ"

نہ جانے کیوں اقبال کو محسوس ہوا کہ اس عورت کی آواز میں شفقت کا ایک خزانہ بھرا ہوا ہے۔ اس کے قدم خود بخود اس کے پیچھے اٹھنے لگے۔

پھر وہ قدم ہر دن اس عورت کے دروازے پر نظر آئے۔ اس کو اس عورت کے پاس وہ آغوش ملی تھی۔ جس کی تلاش میں وہ تھا۔ یہ وہ تو اس آغوش میں دم لینے کے لئے چوری چھپے آتا تھا۔ لیکن بات کب تک چھپتی۔ بیوی نے جب یہ قصہ سن لیا۔ تو وہ اپنے سینے پیٹنے لگی۔ اس نے اقبال سے کہا۔

"یا تم اس رنڈی کے پاس آنا جانا چھوڑ دو ورنہ تم مجھے ہی چھوڑ دو"

بے چارا وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کو کیا کرنا چاہیئے۔ بہر حال وہ آغوش کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بیوی نے اس کو طلاق دی۔

والد نے کہا۔

"مجھے ناز تھا اپنے بیٹے پر۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ شرافت کا دیوتا تھا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ذلیل سے ذلیل حرکت کر سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں سنبھل جاؤ۔ ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

لیکن اقبال کب یہ سوچنے والا تھا کہ کیا اچھا ہوگا اور کیا بُرا ہوگا۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ اس آغوش کو پا کر اس کی دماغی الجھن ختم ہوئی۔ اس لئے وہ یہ آغوش چھینے کے لئے تیار نہ تھا۔ والد صاحب اپنے بیٹے کے اس انداز سے تنگ آگئے تھے۔ تہذیب یافتہ لوگوں نے اس کا جینا دوبھر کیا۔ اب تو ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے اور بیٹے کو سیدھا کرنے کے لئے صرف ایک ہی علاج تھا۔

ایک صبح اقبال نے اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خبر بھی پڑھی کہ اس کے والد نے اس کو تمام جائیداد سے محروم کیا۔ اقبال کو صدمہ ہوا۔ اقبال نے اپنے آپ سے کہا۔

"یہ سب صرف ایک آغوش نے کیا۔ لیکن میں بھی آغوش کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"

وہ عورت کے گھر گیا۔ عورت نے کہا۔

"کیسے آئے ہو؟"

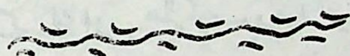
"آغوش میں چلا آیا ہوں ۔ کیونکہ سب لوگوں نے مجھے دھوکا دیا ہے ۔ یہ آغوش مجھے دھوکا نہیں دے گا"۔

عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن پیارے اس آغوش میں وہی بیٹھ سکتا ہے ۔ جس کے پاس دولت ہو ۔ لیکن اب تم ایک فقیر ہو ۔ بھکاری ہو"

اقبال نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

"اُف ـــ اُف ۔ تو یہ بھی آغوش نہیں ہے ۔ جس کی مجھے تلاش تھی ۔ میں تو اس کو ایک ماں کا آغوش سمجھ بیٹھا تھا"۔



سڑک جا رہی ہے

میری محلے میں پہلی بار پختہ تارکول کی سڑک جا رہی ہے۔ بل کھاتی ہوئی اس سڑک کے کنارے ایک مکان کھڑا ہے۔ ایک ایسا مکان جو خود بھی ایک تمثیل بن کے رہ گیا ہے۔ اب تو اس مکان نے اپنے ساتھ ایک مخصوص نام بھی لپیٹ کے رکھا ہے۔

خونی بنگلہ!

شاداب گاؤں میں یہ واحد مکان ہے۔ جو نہ صرف پختہ اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ بلکہ یہ مکان ایک تاریخ بھی اپنے ساتھ وابستہ رکھتا ہے۔ تاریخ بنانے والے صرف انسان ہی نہیں ہوتے ہیں۔ چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ مکان خونی بنگلے کے نام سے مشہور ہوا۔ ہزاروں داستانیں اس مکان کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان داستانوں میں کچھ ہی حقیقت پر مبنی تھیں۔ مغل بادشاہوں کے ایک نوکر خاص نے اپنے لطف و آرام کے لئے یہ مکان بنوایا تھا۔ ناچ اور رنگ کی محفل سے یہ مکان سارے گاؤں میں

چاندنی بن کے رہ گیا۔ مگر مغلوں کے زوال کے بعد نوکرِ خاص کا قتل ہوا۔ انگریز دلّی کے ہاتھ اقتدار آیا۔ پھر ایک صاحب بہادر اس مکان میں رہنے لگا۔ صاحب بہادر کی گوری گوری میمیں اس مکان کی زینت بن گئیں۔ اصلی انگریزی شراب بہنے لگی اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس مکان میں نت اور نئے حالات پیدا ہوئے۔ پھر ایک رات ہاں ایک ایسی رات جب ہر طرف گھنگور گھٹاؤں کے آنچل میں چاند بھی چھپ گیا۔ ایک گوری گوری میم کے جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس مکان میں پائے گئے۔ صاحب بہادر بھاگ گئے۔ اُن کے نوکر کو پولیس نے حراست میں لیا۔ تب سے اس مکان کا نام خونی بنگلہ پڑا۔

انگریزوں کے چند چمچے ہوا کرتے تھے۔ اُن چمچوں کو اس زمانے میں جاگیردار کہا کرتے تھے۔ ایک ایسے جاگیردار کے حصے میں سوتھا محلہ اور شاداب گاؤں بھی آگیا۔ یہ بنگلہ بھی اسی جاگیردار کے حصے میں آیا۔ مگر جوں ہی جاگیردار صاحب اس بنگلے میں داخل ہوئے انگریز حکومت نے دم توڑ دیا۔ جاگیردار صاحب جاگیردار نہ رہے صرف نام کی لیبل چہرے پر چسپاں رہی۔ اس لیبل کو برقرار رکھنے کے لئے خونی بنگلہ کو اونے پونے داموں میں فروخت کرنے کے لئے تیار ہوا۔ شہر کا باشندہ جسکا نام بلنگے لال تھا۔ اس مکان کی ملکیت کو اپنے

نام کرالی۔ اُن ہی دنوں موسی محلے میں پختہ تارکول کی سڑک بنائی جا رہی تھی۔

گاؤں والے کہنے لگے کہ موسی محلے میں پہلی بار تارکول کی سڑک بنائی جا رہی ہے۔

بانکے لال کے بارے میں گاؤں والے کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ لیکن بانکے لال اور بانکے لال کی بیوی اس خونی بنگلے کی طرح ایک تاریخ تھی ایک زمانے میں بانکے لال کے پاس دولت ارزاں تھی۔ یہ تب کی بات ہے جب دوسری جنگ عظیم ہوئی۔ تب بانکے لال نے پیسول کا مال روپیوں میں فروخت کیا۔ پیسے جب روپیوں کے حساب سے آنے شروع ہوتے ہیں تب آدمی کی لاپرواہی انتہا کو چھو جاتی ہے۔ اس انتہا نے بانکے لال کو شراب کا دوست اور عورت کا پرستار بنا دیا۔ لیکن برا ہو بانکے لال کے اس نرم دل کا جو موم کی طرح پگھل پگھل کر چاند بائی کا پازیب بن گیا۔ چاند بائی بہت عرصہ تک بانکے لال کے دل کو پازیب بنانے کے شوقین تھی۔ مگر اچانک ایک دن جب چاند بائی کو اپنے ڈھلتے ہوئے ... ن کا خیال آیا۔ خوابوں کے محل مسمار ہو گئے۔ بانکے لال اپنی انوکھی شرافت کی وجہ سے سارے شہر میں بدنام ہو گئے تھے۔ پھر ایک دن لیکن بہت دیر کے بعد بانکے لال کو خیال آیا کہ اس کے روپیوں کا تھیلا اب

کا ٹوٹ چکا ہے۔ بوڑھاپے کی سوکھی ہڈیوں کو نرم نرم جسم کی ضرورت ہے۔

اب نہ تو چاند بائی اس فکر میں تھی کہ بانکے لال کا دل میرا پازیب بن کے رہ جائے۔ نہ بانکے لال اس فکر میں مبتلا تھا کہ وہ چاند بائی کی بڑی بڑی آنکھوں سے چھلکتا ہوا شراب پی جائے۔ وہ ایک دوسرے کو پھانس لینا چاہتے تھے ــــ پھر ــــ وہ ایک لیبل کے تحت خاوند کی بیوی بن گئے۔

اب بانکے لال کو شہر کی فضا راس نہیں آئی تھی۔ پھر کچھ لوگوں کے تیر و نشتر نے اُس کے سینے کو چھلنی کر کے رکھا۔ وہ جانتا تھا اگر کچھ دیر اور وہ شہر میں رہے گا۔ تو اُس کا دل کام کرنا چھوڑ دے گا۔

اور پھر چاند بائی کے ساتھ وہ شاداب گاؤں کے موسی محلہ کے خونی بنگلہ میں آ گیا۔ لوگ کہتے رہے کہ بانکے لال پر کوئی مصیبت آ پڑے گی۔ مگر بانکے لال مطمئن زندگی بسر کرتا تھا۔ پھر ایک دن بانکے لال کے خونی بنگلہ سے ایک چیخ سنی گئی۔ گاؤں کے لوگ دوڑے دوڑے آ گئے۔ یہ سوچ سمجھ کے کہ آج کسی آفت نے بانکے لال کو کھا لیا۔ لیکن وہاں ایک خوبصورت بچے نے ان کا استقبال کیا۔ لوگ ایک دوسرے کے منہ تکتے رہ گئے۔

بہت دنوں تک بانکے لال اپنے ماضی کے سیاہ پردے کو چھپاتا رہا۔ مگر کب تک ـــــ جبکہ جن کی نگاہیں تیز ہوں۔ وہ بات کو جان لینے کے بغیر دم نہیں لیتے۔

پھر ہر زبان پر یہ بات آگئی۔

"بانکے لال او باش رہا ہے اور چاند بائی کسی زمانے میں مشہور طوائف تھی"۔

چند دنوں کے لئے گاؤں والوں نے بانکے لال کا حقہ پانی بھی بند کیا۔ پھر وقت اپنا کام کرتا رہا۔ لوگ چند دنوں کے بعد سب باتوں کو بھول گئے۔

بانکے لال نے گاؤں میں کریانہ کی ایک چھوٹی دوکان بھی کھولی۔ اچھی طرح کھاتا پیتا تھا۔ بانکے لال کی بیٹی نینا جب چھ سال کی ہوئی۔ بانکے لال نے اس کو گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کیا۔

نینا بڑی شوخ اور تیز لڑکی تھی۔ اپنی بات منوانے کے لئے لاکھ حربے استعمال کرتی تھی۔ گاؤں میں ایک چھوٹی سی ندی تھی۔ وہ چاروں پہر اس ندی میں رہتی تھی۔ ماں اکثر ڈانٹ کر کہتی۔

"اگر ڈوب جاؤ گی تو مر جاؤ گی"۔

وہ کہتی "کیا کروں ماں مجھے پانی کی گود میں رہنے ہوئے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے"۔

چاند بائی کو نینا کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ لیکن نینا ایک آگ کی دریا تھی۔ جس کی نس نس سے حرارت پھوٹتی تھی۔

سات سال کا رمیش شرمیلا لڑکا تھا۔ اُس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ کلاس میں الگ بیٹھا کرتا تھا۔ صرف اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ لیکن نینا کو رمیش کی خاموشی پسند نہیں تھی۔ ایک دن نینا نے رمیش سے کہا۔

"تم میرے دوست بن جاؤ"

رمیش نے شرماتے ہوئے کہا۔

"تم لڑکی ہو"

"تو کیا ہوا؟"

رمیش نے پھر سوال کیا۔

"تو کچھ نہیں ہوا"

"کچھ نہیں ہوا"

تب سے رمیش اور نینا دوست بن گئے۔ اکثر ندی میں اکٹھے نہاتے تھے۔ ایک دوسرے کو ڈبونے اور پانی پھینکنے کی کھیل کھیلا کرتے تھے۔ مگر ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ دونوں سکول

سے واپس گھر آرہے تھے۔ نینا جب اپنے گھر کے پاس پہنچ گئی۔ نینا نے رمیش سے کہا۔

"اچھا رمیش"

پھر جھپٹ سے نینا نے رمیش کا منہ چوم لیا اندر گھر کے اندر بھاگ گئی۔ رمیش بے چارا سکا بکا دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر کی طرف چل پڑا۔

چاند بائی نے نینا کی یہ حرکت کھڑکی سے دیکھ لی۔ پہلے تو اس نے نینا کے چھوٹے چہرے پر اپنے بڑے بڑے ہاتھ سے دو تین تھپڑ رسید کئے۔ پھر کہا۔

"میں جیسی دلدل سے بھاگ آئی تو شاید اسی دلدل میں ڈوب جائے گی" اس دن کے بعد نینا سکول نہیں گئی۔

وقت کی ہوا چلتی رہی۔ نینا چار دیواری میں قید ہو گئی۔ پھر چند سالوں کے بعد ندی تک برتن دھونے کی اجازت مل گئی۔

سولہویں سال کی عمر میں پہلی بار نینا کو محسوس ہوا کہ وہ ایک مضبوط قید میں بند ہے۔ اس کی ہر حرکت پر نگاہ ہے۔ مگر وہ شدید کشمکش میں پڑ گئی۔

اس دن جب پہلی بار موہن اس کے گھر آگیا۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟"
موہن نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"آپ کے پتاجی نے الائچیوں کا یہ پیکٹ دینے کو کہا ہے۔"
پیکٹ دیتے ہوئے موہن کا کھردرا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھو گیا۔ اُس نے کہا۔
"کل شام چھ بجے میں کھنڈروں کے پاس انتظار کروں گا۔"
موہن چلا گیا۔ مگر اُس کا سانولا رنگ اور چہرے کے کھردرے نقوش بہت دیر ذہن میں گھومتے رہے۔ موہن میں نینا نے کشش پائی۔ اُس کے ہاتھ کے لمس میں بڑی گرمی تھی۔ ایک ایسی گرمی تھی جو دل کو سکون اور دماغ کو فرحت عطا کرتی ہے۔
وہ کچھ وقت کے لئے الجھن کی شکار رہی۔ لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے جذبات کا دھارا کب کا ٹوٹ چکا تھا ذہن جذبات کا غلام بن گیا تھا۔
اس لئے وہ چھ بجے کھنڈروں میں نکل آئی اور موہن اس سے کہتا رہا۔
"نینا میں تم کو بہت چاہتا ہوں۔ بہت دنوں سے ندی پر آتے جاتے دیکھتا رہا۔ لیکن آج تک تم سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی لیکن تمہارے باپ نے کہا کہ الائچی کا پیکٹ گھر میں چھوڑ دو۔ مجھے

اپنا کام بنتے ہوئے نظر آیا۔ میں جانتا ہوں۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ مجھے چاہتی ہو۔ کیونکہ تمہارا یہاں آنا ہی اس کی شہادت ہے۔" وہ بہت دیر بہت کچھ کہتا رہا۔ وہ سنتی رہی۔ پھر اُس کو محسوس ہوا کہ وہ خود بخود اس کے قریب ہوتی گئی۔ عہد و پیمان کی ایک لمبی زنجیر بن گئی۔ جنم جنم کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا گیا۔ موہن نے کہا۔

"پھر کل آنا۔"

"نہ آؤں"

"پھر کبھی نہ آؤں گا۔"

وہ سوچتی رہی۔ بہت دیر تک نئے حالات میں ڈوبی رہی۔ وہ ملاقاتیں اب تو اُس کے لئے کھانے کی طرح ضروری بن گئی۔ کبھی ہاتھ سے ہاتھ مل جاتے اور کبھی لب سے لب۔ کبھی وہ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کو گلے لگے رہتے۔ مگر یہ سب کچھ رات کے اندھیرے میں کھنڈروں میں ہوتا تھا۔

پھر ایک ایسی رات آگئی جب موہن نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آج مجھے وہ سب کچھ حاصل کرنا ہے۔ جس کے لئے میں جدوجہد کر رہا ہوں۔ سارا ڈھنگ تو گر گیا۔ مگر اُس بھیانک آواز نے نینا کے سارے جسم کو بے حس کر دیا۔ وہ اُس کے والد کی آواز تھی۔ وہ دوڑی دوڑی گھر کے اوپر والے کمرے میں چھپ گئی۔ مگر والد کی ٹھہڑوں

سے وہ نڈھال ہو گئی۔ تھک ہار کر اُس کے والد نے چاند بائی سے کہا۔
"چاند ۔۔۔ میری بیٹی نے مجھے لوٹ لیا۔ میرے ارمانوں کو قتل کیا۔ پارسائی کی تصویر کو توڑ دیا۔ آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں برسوں سے بیمار ہوں۔"
بانکے لال چند دنوں تک، بخار میں مبتلا رہا۔ واقعی وہ اب صحت مند بانکے لال نہ رہا۔ نینا سے والدین نے بات کرنی بھی چھوڑ دی۔ وہ اپنے آپ کو مجرموں کی طرح پا رہی تھی۔ مگر جب بانکے پہلی بار عصا کے سہارے اٹھا۔ اُس نے چاند بائی سے کہا۔
"میں سور داس کے گھر جاتا ہوں۔ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔"
عصا کے سہارے آہستہ آہستہ سور داس کے گھر بانکے لال پہنچ گیا۔ سور داس نے اُس کو دیکھ کر کہا۔
"بانکے کیا ہوا ہے تمہیں؟"
"بہت مدت کے بعد ایک بات یاد آ گئی۔"
"آدمی بہت کچھ بھول جاتا ہے!"
"سور داس میں یہ نہیں بھول گیا تھا کہ میری ایک لڑکی ہے۔" بانکے لال نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "سور داس مجھے موہن کو دیدو میری نینا تمہاری بیٹی ہو جائے گی۔"
سور داس نے کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔

"بانکے تمہاری بگڑتی ہوئی صحت کے ساتھ تمہاری عقل بھی بگڑ گئی
تم شاید یہ بھول گئے کہ تم اور تمہاری بیوی اپنے ساتھ کوئی ماضی رکھتی
ہے۔ ایسے آدمیوں کو اسی زمرے کے لوگوں کو ڈھونڈنا چاہیئے"۔

بانکے نے جھولی بھی پھیلائی۔ مگر وہ خالی جھولی لے کے واپس لوٹا۔
گھر کے اندر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھوں سے اس عصا چھوٹ گیا۔
چاند بائی نے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"تمہاری بیٹی تمہارے گھر میں رہے گی"۔

وہ بیٹھا۔ سارا جسم پسینے سے شرابور ہوا۔

"چاند میرے دل کو کچھ ہوا ہے۔ شاید مجھے مرنا ہے"۔

دل اب بوجھ برداشت نہیں کر رہا تھا۔ زندگی اب مجبور بن
کے موت کو گلے لگ رہی تھی۔

چاند بائی رو رہی تھی۔ نینا باپ کے سرہانے کھڑی تھی۔ وید
اور حکیم آ گئے۔ لیکن مرض لاعلاج بن گیا۔ بانکے لال نینا سے کہہ
رہا تھا۔

"نینا میری بیٹی مجھے افسوس ہے کہ میں تم کو ایک مطمئن اور سکون
بھرا جیون نہ دے سکا۔ تمہیں میرا ماضی بہت ستائے گا۔ لیکن بیٹی
میں مر رہا ہوں"۔

اور پھر بانکے لال مر گیا۔ چاند بائی کو روتے ہوئے چھوڑ گیا۔ بینا اُس کے سرہانے مرجھائے ہوئے پھول کی طرح کھڑی تھی۔

مرنے والے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جو باقی رہتے ہیں۔ وہ آنے والے دنوں کے بوجھ کے نیچے دب جاتے ہیں۔ اُن کے لیے خیال سہارا بن جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چاند بائی کے لیے یہ خیال سہارا بن گیا کہ کوئی نہ کوئی اس کی بیٹی کا ہاتھ تھامنے والا ہوگا۔

پھر ایک دن ایک ایسا آدمی آگیا۔ اُس نے چاند بائی سے کہا۔ "ہوا کیا جو وہ آدمی تھوڑا سا عمر میں بڑا ہے۔ پہلی بیوی مر گئی ہے اُس بیوی کے دو بیٹے ہیں۔ لیکن امیر ہے امیر۔ دولت کی دیوی اُس پر مہربان ہے۔ ایسے رشتے روز روز نہیں آتے۔ پھر تو کچھ اپنے ماضی کا بھی خیال کرو!"

چاند بائی کے لیے راستہ بند ہو گیا۔ اقرار میں سر ہلانا پڑا۔ شادی کے لیے ہری لال کے پیسے آئے۔ چاند بائی کے ہاتھوں کوئی دو ہزار روپے لگ گئے۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"چلو اچھا ہوا۔ ایک بیٹی پر کوئی پیسہ خرچ نہ ہوا اور اوپر سے دو ہزار ہاتھ آئے۔ لیکن برات آئی۔ شہنائی بجی۔ تب ہری لال کا ساٹھ سالہ لٹکا ہوا چہرہ نظر آیا۔

چاند بائی نے بیچ والے آدمی کو پکڑا۔

"یہ تو بوڑھا آدمی ہے"!

"چپ کرو چاند بائی ــــ چپ کرو۔ تمہیں اپنے ماضی پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ جہاں تمہارے پازیب کی جھنکار پر رنگ برنگے نوٹ ملتے تھے۔ وہ نوٹ آج تمہارے گلے کی پھانسی ہے"!

وہ خاموش ہو گئی اور خاموشی سے پھول جیسی نینا کو ہری لال کے حوالے کیا۔ اب نینا کے پاس صبر کے سوا چارہ نہیں تھا۔ ہری لال کی حویلی بہت بڑی ضرور تھی۔ مگر خاموشی کا ایک غار تھا جہاں دو بوڑھے نوکر تھے۔ ان بوڑھوں میں ایک جوانی اپنے آپ کو بے بس پا رہی تھی۔

نینا جانتی تھی کہ ہری لال بوڑھا ہے۔ اُس کے ارمان بوڑھے ہیں۔ مگر اُس کے جذبات میں شاید اب بھی گرمی ہو گی۔ شاید اب بھی اس کا دل حرارت رکھتا ہے۔ اگرچہ اُس کے ناتوان ہاتھوں میں کپکپاہٹ نینا کو صاف نظر آ رہی تھی۔ لیکن جذبات کا عمل کچھ اور تھا۔

ہری لال نے اپنی نئی دولہن کا گھونگھٹ الٹا دیا۔ پھر اپنے بوسیدہ ہونٹ اُس کے سرخ دہکتے ہوئے ہونٹوں سے ملا لئے۔ اُس کے ہونٹ جل گئے۔ دلہن اُس کے بوڑھے سینے سے چپک جاتا

چاہتی تھی۔ مگر وہ نوکیلی ہڈیاں اس کے نرم نرم گوشت کو کاٹ ڈالتے تھے
جب نیئن گھسنے مابین گئے تو اس کو معلوم ہوا۔ وہاں صرف جذبات
تھے۔ عمل نہیں تھا۔ تب وہ رات کے آخری پہر بازو پھیلائے ہوئے
خدا کو کوسنے لگی۔ وقت نے رفتار پکڑلی۔ نینا اپنے کچلے ہوئے جذباتوں
کے تلے دب گئی۔ خواہشات مردہ ہوگئے۔ زندگی ایک پھیکی تصویر
بن گئی۔ ہری لال نے ایک دن نینا سے کہا۔
"صبح میرا وکیل بیٹا آرہا ہے"
نینا نے ماں کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔
"بھگوان کرے وہ اچھا ہو"
ہری لال نے کہا۔
"اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہے۔ میں اس بنگالی لڑکی کے
ساتھ اس کی شادی کے خلاف تھا۔ مگر تمہارے آنے کے بعد میرے
خیالوں میں تبدیلی آگئی۔ میں نے اس کو بلایا"
"بہت اچھا ہوگا جو بیٹا واپس آئے گا"
ہری لال دوسرے دن اپنی بیل گاڑی میں وکیل بیٹے اور اس
کی بنگالی بیوی کو لایا۔ شیکھر نے اپنے باپ سے کہا۔
"پتاجی باغوں کا کام کیسا ہو رہا ہے"
"اب تم آگئے ہو تو خود ہی کام سنبھال لوگے"

شیکھر کی بیوی رادھا نے کہا "شیکھر شائد تم وکالت چھوڑ کے کسانوں کا کام نہیں کروگے"۔

"ہاں ایسا ممکن تو نہیں ہے"۔

ہری لال کا چہرہ لٹک گیا۔ نیناں نے ماںمتا بھری آواز میں شیکھر سے کہا۔

"کیسے ہو بیٹے؟"

شیکھر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم شاید میری نئی ماں ہو"۔

"شائد نہیں ہوں"۔ نیناں نے اپنے حق پر زور دیا۔

رادھا نے شیکھر کے کان میں کہا۔

"ناگن ہے ناگن۔ اُس نے تمہارے باپ کو پھانس لیا۔ تم بچ کے رہنا"۔

شیکھر نے اونچی آواز میں کہا۔

"کیا ہوا تم کو؟"

رادھا کا سر جھک گیا۔

حویلی ضرور حویلی تھی۔ مگر اس میں رہنے والوں کے دل حویلی نہیں تھے۔ رادھا اُکھڑی اُکھڑی رہتی تھی۔ شیکھر اپنی ماں کی جگہ کسی دوسری عورت کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

نینا میاں بیوی کو ہنسنے کھیلتے ہوئے دیکھ کر اپنے سارے تن بدن میں آگ محسوس کر رہی تھی۔ وہ جذبات جو عرصہ سے مُردہ پڑے تھے زندہ ہو گئے۔ اُن کی کچلی ہوئی خواہشوں میں پھر جوانی آ گئی جو کسی بوڑھی روح نے روندھ لئے تھے۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے اور وارفتگی کے عالم میں آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اپنے تشنہ جذبات کی پیاس کسی بھی طریقے سے بجھا سکتا ہے۔ ایک ایسی رات کو وہ شیکھر کے دروازے کے قریب کھڑی رہی۔ جہاں سے شیکھر اور رادھا کی سانسیں اس کے دماغ کو فرحت عطا کرتی تھی۔

اُن کی جذباتی باتوں سے وہ مسرت کے گہوارے میں ڈوب جاتی پھر یہ کھیل دیکھنا اس کا روزانہ کا معمول بن گیا۔ ایک دن وہ رادھا کے ہاتھوں پکڑی ہی گئی۔

"ماں جی یہ اچھی بات نہیں ہے!"

نینا چپ کے سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خاموشی کے ساتھ سو گئی۔ مگر دوسرے دن جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا۔ رادھا اور شیکھر کلکتہ واپس جا رہے ہیں۔

نینا نے شیکھر سے کہا۔

"تم جا رہے ہو"۔

"ہاں میں جا رہا ہوں۔ میں وکیل ہوں۔ میرا کام یہاں نہیں ہے۔

میرا کام شہر میں ہے۔ اس لئے میں واپس شہر جا رہا ہوں"۔
اس دن اُس نے پھر سارا وقت بستر میں نیند کے حوالے کیا۔
شنکھر چلا گیا۔ لیکن بہت دنوں تک نینا کے کانوں میں اس کی سانسیں سرگوشیاں کرتی رہیں۔ مگر کسیلے جذبات کو تقویت نہیں پہنچ سکی۔ اس تپش میں نینا جلتی رہتی اور کبھی کبھی اپنے اس گرم جسم کو گھنٹوں نہلاتے ہوئے سرد کرنا چاہتی تھی۔
ایک صبح ہری لال کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔
"مبارک ہو نینا۔ تمہارا بیٹا برج یونیورسٹی میں فسٹ آیا۔ وہ پرسوں آرہا ہے"۔
نینا کے لئے یہ خبر مسرت تھی۔ برج کے کمرے کی ہر چیز خود اُس نے اپنے ہاتھوں سے خوب صاف کی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہر چیز پر اپنی چھاپ چڑھا لینا چاہتی ہے۔
اور پھر ایک صبح اس کے سامنے برج کھڑا تھا۔
"برج کیسے ہو"؟
اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اچھا ہوں۔ آپ کیسی ہیں"؟
"میں بھی اچھی ہوں"۔
برج کے کھانے کی، برج کے کپڑے کی، برج کے جوتوں کی، یہاں

تک کر برج کی ہدایت کا وہ خیال رکھتی تھی۔ اور خود اپنے ہاتھوں سے وہ اُس کا سارا کام کرتی تھی۔

برج نے ایک دن اس سے کہا۔

"تم میرا بہت خیال رکھتی ہو!"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ برج نے کہا۔

"تم عمر کی بہت چھوٹی ہو۔ پھر کیسے میرے باپ سے رشتہ جوڑ لیا۔ مجھے یہ رشتہ دیکھ کر بڑی کوفت ہو رہی ہے۔ میں نہیں جانتا ہوں کس مجبوری نے تمہیں اپنا جیون برباد کرنے کے لئے مجبور کیا!"

"قسمت کی بات ہے!" نینا نے مختصر جواب دیا۔

"آدمی ہر بُری بات کو قسمت کہتا ہے۔ مجھے واقعی افسوس ہو رہا ہے!"

"تم مجھے نینا کہا کرو"۔ نینا نے کہا۔

برج اُس کو بہت دیر تک حیرانگی سے تکتا رہا۔ پھر ایک دن جب برج کو سر درد تھا اور نینا اس کا سر بہت دن دباتی رہی۔ تو برج نے کہا۔

"تمہارے پھول سے ہاتھوں میں کوئی جادو ہے۔ درد اب آہستہ آہستہ ختم ہوا!"

نینا نے اپنے دہکتے ہوئے ہونٹوں کو اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے

کہا۔

"میرے اچھے برج۔"

اس کے ہونٹوں کے لمس نے برج کی ساری بدن میں برقی لہر دوڑائی۔ وہ بہت دیر تک نینا کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر ایک آہ بھرتے ہوئے خود سے کہا۔

"ایک اچھی لڑکی کی زندگی برباد ہوگئی ہے۔"

ایک رات بڑی زور زور کی ہوائیں چلیں۔ کالے بادل گرج پڑے۔ بجلیاں چمک اٹھیں۔ آدھی رات کے وقت نینا کو برج کا خیال آیا۔ اس نے سوچا۔

"کہیں برج ڈرتا تو نہیں ہوگا۔"

وہ دوڑی دوڑی اس کے کمرے میں آگئی۔ برج نیند میں مست پڑا اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر لیا۔ برج نے آنکھیں کھولیں۔

"اچھے ہو برج۔"

برج نے سوچا وہ شاید کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ مگر ساڑھی کا پلہ گر کے نینا کی جوانی کا اعلان کر رہی تھی۔ اس نے نینا کو اپنی طرف کھینچ لیا اور بے ترتیب سانسوں میں کہا۔

"تم میری ہو۔"

نینا نے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ہیں۔ میں تمہاری ہوں۔"

پھر اس رات کے کالے بادل اور تیز بجلیاں ان کے ارادوں میں حائل ہو گئے۔ نینا عورت بن گئی۔ اس کے ارمانوں میں بہار آگئی۔ اور وہ اپنے آپ کو ہوائیں چلتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ اس نے برج

سے کہا۔

"آؤ برج کہیں بھاگ جائیں"۔

برج نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہم بھاگ سکتے ہیں۔ مگر ہم بھاگ نہیں جائیں گے"۔

مگر وہ دونوں ایک دوسرے کے قربت کے بغیر پیاس سے محسوس کرتے تھے۔ مگر رشتوں نے ضمیر کو بہت عرصے تک اپنے جھانسے میں رکھا۔

ہری لال اپنے باغوں اور کھیتوں میں مصروف تھا۔ پیچھے کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا۔

پھر اچانک اس کی بوڑھی ناک نے کچھ سونگھنا شروع کیا۔ ایک دوپہر ہری لال چپکے سے برج کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں نینا اور برج کو محو بوسہ پایا۔ بوڑھا ٹوٹ گیا۔ اس نے کہا۔

"برج"۔

برج اور نینا کو ہوش آیا۔

اچانک وہ چیخ پڑا۔

"لعنت ہو تم پر برج۔ تم میرے بیٹے ہو — نہیں — نہیں۔ تمہاری رگوں میں میرا خون نہیں دوڑ رہا ہے۔ تم کمینے ہو۔ تم ذلیل ہو"۔

برج تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہا۔ پھر اس نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"پتا جی کون ذلیل ہے؟ کون کمینہ ہے؟ کوئی نہیں کہہ سکتا ہے۔ تم نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ و برباد کی ہے۔ میں نے اس کو خوشی دی۔ زندگی دی"۔

بوڑھے نے کہا۔
"تم نے ماں کے رشتے پر حملہ کیا۔"
"پتا جی رشتے ہم خود ترتیب دیتے ہیں۔ مت کسی کے راستے کا پتھر بن جاؤ۔"

بوڑھا اس کے بعد کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اپنے باغوں اور کھیتوں میں نہیں گیا۔ وہ حویلی واپس نہیں آیا۔ اس کو معلوم نہیں تھا۔ وہ کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ اس کے بوڑھے پاؤں کہاں کہاں چل پائے۔

برج نینا سے کہہ رہا تھا۔
"پتا جی ہم سے دور چلا گیا۔ یہ ہم نے اچھا نہ کیا۔"
نینا کہتی ہے۔
"لیکن اس نے اپنے لئے ضرور اچھا کیا۔"
"اب اس گاؤں میں ہمارا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"
"ہاں یہاں سے دور چلا جانا ہوگا۔"

پھر وہی پختہ تارکول کی سڑک جا رہی ہے۔ اسی سڑک کے ایک طرف خونی بنگلہ کھڑا ہے اور خونی بنگلے کے سامنے ایک بھکاری جس کی داڑھی بہت لمبی تھی۔ جس کے ہاتھ پر کوئی کچھ رکھ کے چلا جاتا تھا۔

برج اور نینا میاں بیوی بن کے خونی بنگلے میں رہنے آ گئے۔ انہوں نے بھکاری کے ہاتھ میں بیس پیسے رکھ دئے۔ بھکاری نے کہا۔
"تمہاری جوڑی بنی رہے۔"

مگر دوسرے لمحے جب بھکاری کی نگاہوں نے ان کو دیکھ لیا۔

"ہم" مگر وہ آواز ابھر نہ سکی۔ بوڑھے کی زندگی صلیب پر چڑھ گئی۔

